خطوطِ غالبؔ کا فنّی جائزہ

مصنفہ : حامدہ مسعود

تقسیم کار : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

خطوطِ غالبؔ کا فنّی جائزہ

مصنفہ : حامدہ مسعود

PDF & Title By : Ghulam Mustafa Daaim

تقسیم کار : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اشاعت اول	۱۹۹۲ء
تعداد	پانچسو
ناشر	طاہرہ تھانوی، سرسید نگر، علی گڑھ
قیمت	۲۰ روپے
مطبع	لیتھو کلر پرنٹرس اچل تال، علی گڑھ

مسعود کے نام

تعارف

اپنے اردو خطوط کے بارے میں غالب نے ایک جگہ لکھا ہے:

"کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے تعلقات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔"

اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اردو خطوط، کم از کم ابتدائی دور میں، نہ دل لگا کر لکھے اور نہ قلم سنبھال کر، بلکہ بہ امر مجبوری، یہ وسیلہ اظہار اختیار کیا۔ وقت کی قلت اور قویٰ کا اضمحلال اس کا سبب بنا اور سہولت اس کی محرک ہوئی۔ اور اس طرح انھوں نے خود کو اس کاوش و پژوہش سے فارغ کر لیا جو انھیں فارسی مکتوب نگاری میں پیش آتی تھی اور حالات کے جبر سے محض "تحریری سرسری" پر اکتفا کر لیا۔ انھوں نے اپنی فارسی شاعری کی رنگا رنگی کے مقابلے میں اپنی اردو شاعری کو بھی اسی طرح "بیرنگ" اور بے وقعت قرار دیا تھا۔ اسی طرح اردو نظم اور نثر دونوں ہی کو انھوں نے اپنی شان سے فروتر تصور کیا۔ اتفاقات کی بوالعجبی اور حالات کی

ستم ظریفی دیکھیے کہ ان تخلیقات ہی نے جن کو وہ حقیر اور کم مایہ قرار دیتے رہے ان کی شہرت و مقبولیت کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔

غور کیجیے تو خطوط نگاری ہے ہی دراصل بے تکلف نگارش کا فن! کاروباری رقعات کو چھوڑ دیجیے۔ ہم خط انھیں کو لکھتے ہیں جن سے تکلف نہیں رکھتے۔ جن کی چھوٹی بڑی خوشیوں سے ہم خوش ہوتے ہیں اور جن کے غموں کو اپنا غم سمجھتے ہیں، جنھیں اپنے غموں اور خوشیوں میں شریک کرنا چاہتے ہیں، جن کے سامنے اپنے مصنوعی چہرے اتارنے میں تامل نہیں کرتے، جن کے ساتھ خود بھی خلوص رکھتے ہیں اور جن کے خلوص پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اس لیے نہ اُن کے سامنے اپنی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانے میں باک ہوتا ہے اور نہ دردِ دل سنانے میں کوئی تردد! غالب کے فارسی مکتوبات ان کی اعلیٰ انشا کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن خطوط اس بے تکلف دنیا سے باہر کی چیز ہیں۔ اردو خطوط میں نہ کاوش ہے نہ پژوہش اور نہ آورد۔ یہ سب خطوط قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور حالات کی منہ بولتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مکتوب نگار کے کیا معمولات ہیں، صبح سے شام تک زندگی کس طرح گزرتی ہے، نشست و برخاست کیسے رہتی ہے، موسم کیسے ہیں اور ان کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ کھانے پینے میں کون سی اشیا اور کتنی استعمال ہو رہی ہیں، اور کیوں؟ لباس کیسے استعمال ہو رہے ہیں۔ دوست و احباب اور اعزا و اقارب سے کیا تعلقات ہیں، اپنے مربیوں سے کس طرح کے روابط ہیں، شہر میں اور اڑوس پڑوس میں کیا ہو رہا ہے۔ دل و دماغ پر کیا واردات گزر رہی ہے۔ غرض ان خطوط میں گفتنی اور ناگفتنی سب ہی کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اور یہ خطوط زندگی

کی صرف اعلیٰ باطنی واردات کے ہی آئینہ دار نہیں بلکہ ان میں زندگی کی تریک حقیقتیں اور کیفیتیں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں جن سے غالب کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

مگر ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ یہ خطوط اس شخص کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہیں جو اس سے بیشتر فارسی نظم و نثر اور اردو نظم میں اپنے خلاقانہ جوہر کا لوہا منوا چکا ہے، اس کی سادگی بھی پرکاری سے خالی نہیں ہے۔ اس کی "بات بات میں اک بات" کی شان موجود ہے۔ ان خطوط میں بھی غالب کی شخصیت کے تمام جوہر کھنچ آئے ہیں۔ وہ ان کی بذلہ سنجی ہو یا ظرافت، شوخی ہو یا طنز، تصوف و فلسفہ ہو یا ملکہ زبان دانی، آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، غمِ عشق ہو کہ غمِ روزگار، شکوۂ دہر ہو یا گلۂ مقدر — ان خطوط کے تانے بانے میں یہ سب شامل ہیں۔ غالب نے ان کو خواہ "سرسری" لکھا ہو لیکن ہم ان سے سرسری نہیں گزر سکتے۔ شعر غالب کو ان کی فکر نے تہہ داری عطا کی تھی۔ ان کی واقعیت نگاری نے خطوط کو گراں باری عطا کی ہے۔ اور اسی لیے ایک عرصہ سے خطوط غالب مطالعہ کا موضوع بنے رہے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ غالب کے نثری اسلوب کا بھی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے اور ان کی حیات کا بھی۔ اپنے خوردوں اور معاصروں سے ان کے تعلقات کا بھی، زندگی کے بارے میں اُن کے رویوں اور تصورات کا بھی، ان کے ادبی موقف اور سخن سنجی کا بھی، مگر جس طرح ان کی شاعری کے نت نئے پہلو نکلتے چلے آرہے ہیں۔ ایسے ہی ان کی نثر شناسی کے امکانات بھی ابھی ختم نہیں ہوئے۔ حامد مسعود صاحب کا زیرِ نظر مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے تاریخی اور سوانحی مطالعہ کے بجائے ان خطوط کے

فنی تجزیے پر توجہ کی ہے۔ موصوف نے تجزیوں کے ذریعہ ان کی زبان و بیان
فنی خوبیوں، ادبی محاسن، مرقع نگاری اور اثر آفرینی وغیرہ کو اجاگر کرنے
کی کوشش کی ہے۔ معروضی تجزیوں کے بعد انھوں نے بہت ہی احتیاط
لیکن ژرف نگاہی کے ساتھ نتائج اخذ کیے ہیں اور معتدل انداز میں
اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، گویا انھوں نے غالب کی طرفداری سے زیادہ
سخن فہمی کا ثبوت فراہم کیا ہے، ان کی عبارت میں پختگی اور شگفتگی کا
عمدہ امتزاج نظر آتا ہے۔ غالب شناسی میں اس مقالے کو ایک قابل
قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(پروفیسر) عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

دیباچہ

غالب شناسی کی خواہش نے غالبیات کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان ادبی کاوشوں کو غالب صدی تقریبات سے بڑی تقویت پہنچی ہے۔ شاید ہی ان کے فن کا کوئی پہلو ایسا ہو جس پر کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا ہو۔ اور مستقبل کے غالب شناس بھی اپنے عہد کے تقاضوں اور اپنے ذاتی میلانات کے مطابق فن کار کی تخلیقات کے نئے گوشے اور زاویے تلاش کریں گے کہ ہر بڑے ادیب اور شاعر کی نو دریافت ادب کا فطری عمل ہے، ورنہ یہ قافلہ کیوں کر گرم سفر رہ سکتا ہے۔ جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے غالب کے خطوط اور فن پر چند خیال انگیز مضامین کے علاوہ کوئی مفصل اور بالاستیعاب تجزیاتی مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ مطالعہ اس کمی کو پورا کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔

نجی خطوط میں عموماً بے تکلفی کار فرما ہوتی ہے، دو افراد کے درمیان کچھ نجی اور کچھ کاروباری امور گفتگو کا موضوع بنتے ہیں۔ اپنے بیان کے مطابق غالب نے شعوری طور پر مراسلے کو مکالمہ کی رنگ دینے کی کوشش کی جس سے سطحی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کے فن کا تجزیاتی مطالعہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہو۔ لیکن خطوطِ غالب کے سرسری مطالعہ سے پتہ

چلتا ہے کہ یہاں بے تکلفی کے غالب عنصر کے پس پردہ نہ صرف درد و احساس کی تپش موجود ہے بلکہ مضامین کی ترتیب، الفاظ کے در و بست اور جملوں کی ہیئت کا خاص اہتمام ہے، جو خیال اور مضمون کے زیر و بم کا عکاس بھی ہے اور اس سے ہم آہنگ بھی۔ تاہم یہ غیر منطقی بات ہے کہ غالب جو فارسی میں عبارت آرائی اور معنیٰ آفرینی کے بڑے شائق تھے وہ اردو میں سہل نویسی کے دعوے کے باوجود اپنی پرانی روش کو یکسر فراموش کر دیتے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ پرانی عادتیں سوچنے کا ڈھنگ اور بیان کا انداز بدلتے بدلتے بھی لکھنے والے کو اپنی روایات سے کسی نہ کسی حد تک پیوستہ ضرور رکھتی ہیں۔ اس خیال نے موجودہ مطالعہ میں میری رہنمائی کی اور خطوط غالب کے اسلوب کی بساط بھر تفہیم نے اس کی تصدیق بھی کی جس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔

غالب کے خطوط میں بھی وہی عناصر شعوری یا غیر شعوری طور سے موجود ہیں جن کو انھوں نے اپنی سخن دانی کا طرۂ امتیاز سمجھا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے یہاں جدید نثر کی داغ بیل پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بعض خطوط میں ڈرامائی انداز اور حرکیت نثر کو پرانی داستان گوئی کے حصار سے نکال کر جدید فکشن کے دائرے سے قریب تر کرتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر شمالی ہندوستان اور اردو ثقافت کا ماحول سازگار ہوتا تو غالب اردو کے پہلے ڈرامہ نگار ہوتے، اسی طرح بعض خطوط میں بیانیہ توضیحی اور استدلالی اسلوب نثر کی اس توانائی کا مظہر ہے جو جدید دور کی نثر کے تقاضوں اور ضروریات کی نشان دہی کرتی ہے۔

مفکرین کے نزدیک فن اور شخصیت کا تعلق متنازعہ فیہ مسئلہ رہا ہے

اس کی تفصیلات میں جائے بغیر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فن کو شخصیت سے لاتعلق نہیں کیا جا سکتا۔ اس خیال سے غالب کے خطوط کا فنی تجزیہ ایک تشنہ کوشش محسوس ہو سکتی ہے۔ لیکن کچھ تو طوالت کے خوف اور کچھ اس خیال سے کہ ان خطوط کے مشمولات اور ان کے پس پردہ شخصیت کی کارفرمائی پر نسبتاً زیادہ لکھا جا چکا ہے۔ پیشِ نظر مطالعے میں ان دونوں پہلوؤں کو توجہ کا مرکز نہیں بنایا گیا ہے۔ البتہ مطالعے کی آخری منزل میں اس شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔ جو ان کے خطوط میں ابھرتی ہے، نیز اس کی طرف اسلوب کے تجزیے کے دوران جستہ جستہ اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ چونکہ مضامین کا تنوع اور دائرے کی وسعت زیادہ تفصیل کی طالب ہے اس لیے اس گوشے کو سامنے لانے کے لیے ان کے کچھ اہم خطوط انتخاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں جو غالب کی عصری آگہی اور ذاتی تجربات کی ترجمانی کے علاوہ ان کی شخصیت کا معتبر عکس بھی سامنے لاتے ہیں، جن کے لیے ناقد کے الفاظ سے زیادہ خود غالب کا اپنا بیان ہی انصاف کا حق ادا کر سکتا ہے۔

یہ خطوط بیشتر غلام رسول مہر کے مجموعہ سے ماخوذ ہیں، البتہ چند خطوط جو اس میں موجود نہیں تھے۔ خلیق انجم کے مجموعے میں سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط آفاق حسین آفاق کے نادرات غالب سے منتخب کیے ہیں۔ مرکزی تجزیاتی مطالعہ میں بھی اقتباسات بیشتر غلام رسول مہر سے پیش کیے گئے ہیں اور صفحات نمبر بھی انہی کے ایڈیشن سے ہیں، مکاتیب غالب امتیاز علی عرشی اور نادرات غالب سے

جو اقتباسات لیے گئے ہیں وہاں متعلقہ مجموعوں کے صفحات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

مطبوعہ کتب اور مضامین سے استفادے کا اعتراف کتابیات کے علاوہ حواشی میں بھی کیا گیا ہے۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کی رہبری کا تذکرہ نہ کروں۔ پروفیسر خورشید الاسلام کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مطالعۂ غالب کے اس نسبتاً تشنہ پہلو کی طرف میری توجہ دلائی اور وقتاً فوقتاً میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی کی میں ممنون ہوں کہ انھوں نے مسودے پر نظر ڈالی، مفید مشوروں سے نوازا اور تعارف لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ پروفیسر ثریا حسین کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے لیے میں تہِ دل سے مشکور ہوں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز کے مشوروں اور اشاعت و طباعت کے ضمن میں رہبری نے مجھے بعض حوصلہ شکن پریشانیوں سے محفوظ رکھا۔ مختلف مراحل میں ڈاکٹر شہریار کی ہمدردانہ دلچسپی بھی تقویت کا باعث رہی۔ پروفیسر وحید اختر (شعبۂ فلسفہ) کی اکثر تیکھی لیکن پرمغز گفتگو اور اپنائیت آمیز تنقید نے میری "جسارتِ تصنیف" برقرار رکھنے میں مدد دی۔ اس کے علاوہ میں پرنسپل ویمنز کالج ڈاکٹر رضیہ خاں کی دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ کو ہر طرح موقع دیا کہ اس کام کو جلد مکمل کرسکوں۔ مسز شاکرہ فاروق لائبریرین ویمنز کالج کی کتابوں کی فراہمی میں ہر ممکن کوشش لائقِ شکریہ ہے۔ اسی ضمن میں مسٹر ایم۔ ایچ رضوی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری اور ضیاء الدین انصاری (شعبۂ مخطوطات) کی شکر گزار ہوں۔

اور اپنے گھر والوں کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ احساس لطیف پر بار نہ ہو۔ سچ پوچھیے تو بچوں کی فراہم کردہ نفسیاتی طمانیت اور اپنے شوہر کی ذہنی رفاقت کے بغیر اس معمولی سی کاوش کا منت کش تعبیر ہونا مشکل تھا۔

آخر میں عزیزی اسد یار خاں منیجر مسلم ایجوکیشنل بک ہاؤس اور لیتھو کلر پرنٹرز کے مہیش گپتا اور رتن گپتا کا بھی شکریہ جن کی کوشش سے اس تحریر نے لباس طباعت پایا۔

حامد مسعود

جلیل ہاؤس
ذاکر باغ
ایم یو، علی گڑھ
مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۸۲ء

فہرست

صفحات

عرصۂ دراز تک ادب صناعی کا مرہونِ منت سمجھا گیا۔ چنانچہ بے تکلف اور قلم برداشتہ
ملفوظات کو اس کے دائرے میں مشکل ہی سے جگہ ملی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دو ہزار سال
سے کچھ پہلے مکتوب نگاری کی ادبی اہمیت کا اعتراف ہو چلا تھا اور بعض مشاہیر کے خطوط صدیوں
تک ادبی شاہکار کی حیثیت سے مشرق اور مغرب کی دانش گاہوں میں داخلِ نصاب بھی رہے۔
لیکن مجموعی طور سے اس صنف کی پوری قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ جدید مدنیت کے تقاضوں
کے ماتحت یہ طرزِ اظہار نئی افادیت اور اہمیت کا حامل ہوا۔ ذہنی اور کاروباری وابستگی کی
ہمہ گیری، فاصلوں اور مسافت پر انسانی تعلقات، اور رشتوں کی بالادستی اور ذرائع رسل و رسائل
کی روز افزوں آسانیوں نے اس روایت کو نئی حیات اور حرکت سے آشنا کیا۔ اس طرح مختلف
خارجی اور داخلی عوامل کی آمیزش سے ایک تازہ صنفِ ادب کا خمیر تیار ہوا۔

خطوط نگاری کے متعدد اقسام ہیں۔ مذہبی اور سیاسی نوعیت کے خطوط نے عالمی تاریخ کے
اوراق پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں اور ان کے پیروؤں نے خطوط کو دعوتِ حق
کے لیے استعمال کیا۔ سربراہانِ حکومت کے مراسلوں اور شاہی فرمانوں کی اہمیت کا اندازہ اس
سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تیاری میں علمِ انشا کے ماہرین کی بہترین دماغی قوتیں صرف ہوتی تھیں
اس فن کی قدر دانی کی بدولت ترسّل کتابت اور دبیری کے فن پر عبور فضیلت کی نشانی
سمجھی گئی۔ لیکن نجی خطوط کی جداگانہ نوعیت ہے۔ دور دراز فاصلے سے جب ایک انسان خط کے
ذریعہ دوسرے انسان سے مخاطب ہوتا ہے تو یہ باتیں انسانی دردمندی میں تپ کر خاص شکل
و شباہت اختیار کرتی ہیں۔ نجی زندگی کے شب و روز میں رونما ہونے والی چھوٹی چھوٹی باتوں

کا احوال پرکشش ہوتا ہے۔ ان میں انسانی تعلق کے سورنگ آشکار ہوتے ہیں۔ مکتوب نگار کی آواز سامع کی حسّیات پر اثرانداز ہوکر دونوں کو روحانی طور پر ایک دوسرے سے قریب لے آتی ہے۔ فاصلے سمٹ کر رفاقت کے احساس کو بیدار کرتے ہیں۔ یہی بھی خطوط کا خاص انعام ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی حکومت نے جہاں دلی کے سیاسی اقتدار کو رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لیا۔ وہاں عام ملکی حالات کو بہتر بنانے کے لیے عملی اقدامات شروع کیے۔ جن میں ڈاک ٹکٹ کا اجراء اور ریلوے لائن کا شروع ہونا قابلِ ذکر سہولتیں ہیں۔ ان سے خطوط نویسی کو بالواسطہ بڑھاوا ملا۔ نقل وحرکت اور ڈاک کے نظم نے لین دین اور تجارت میں ہماہمی پیدا کی۔ عام زبان کی ضرورت نے اردو زبان کی افادیت کو اُبھارا۔ لیتھوگرافی کے مطبع کی ابتدا ہوئی اور سائنس اور ریاضی کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ اخباروں کی طباعت سے لوگوں کو حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے میں مدد ملی۔ آگہی کی یہ لہر کتنی ہی آہستہ خرام کیوں نہ ہو تاہم شعور کی زیریں سطح پر ایک ناقابلِ تردید احساس ضرور تھا۔ حالات کی اس نئی کروٹ میں اردو زبان کو غیر متوقع طور پر مقبول ہونے کا موقع ملا۔

"اردو نثر کی اصلی بنیاد رائج الوقت علمی اغراض کے لیے اس وقت پڑی جب ۱۸۳۹ء میں فارسی جو ملکی انتظام، ہندوستانی درباروں سے خط و کتابت اور مقامی دفتروں کی ضرورتوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی"[1]

چنانچہ اردو نثر علمی اغراض کے استعمال کے لیے تیار ہوئی۔ لیکن فارسی سات آٹھ سو سال تک شمالی ہندوستان کی علمی زبان رہی تھی۔ لہٰذا عدالتی، دفتری اور نجی مراسلت میں اردو

---

[1] عبداللہ یوسف علی — انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ — ص ۱۲۹

متواتر استعمال ہونے کے باوجود عرصۂ دراز تک فارسی کی منت پذیری سے سبک دوش نہیں ہو سکی۔

انیسویں صدی کے وسط میں فارسی زبان کے کاروباری زوال کے بعد جب اردو نے اس کی جگہ لی تو اس میں خط و کتابت کا رواج بڑھتا گیا۔ لیکن اس کا انداز فارسی مکتوب نویسی کا چربہ تھا۔ چنانچہ اردو خطوط نویسی کے ابتدائی نمونے انشائے خرد افروز، مکتوبات احمدی دمحمدی اور رقعات عنایت علی فارسی رقعات کی مرصع عبارتوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے تھے۔ جو اس زمانے کے مذاقِ عام کی تعریف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر باکمال منشیوں کی انشار پردازی کا معیار ان خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے جو انھوں نے بیگمات اودھ کی طرف سے نواب واجد علی شاہ کو لکھے تھے۔ نواب شیدا بیگم کی طرف سے یہ خط اس زمانے کی پسندیدہ اور محبوب طرز میں سپردِ قلم ہوا ہے۔

"مجمع جود و کرم، صاحبِ سیف و علم، حضرت سلطان زید اللہ

عشقہٗ،

بڑا ہے یہ ظلم و ستم کہ تم نے محبت نامہ نہ کیا رقم، سچ کہو
تمہیں خدا کی قسم، کیوں ہو گئے ہم سے برہم، ہم کو اس کا بہت
ہے غم، کس نے الفت کی ہے کم، اپنا فرقت سے نکلتا ہے دم،
تم کو کچھ نہیں اس کا رنج و الم، میں دعا یہ کرتی ہوں ہر دم، کہ
خیریت سے لائے تم کو ربِ اکرم، پھر ہم تم ہوں باہم، اور
نورِ چشم نگیں آرا بیگم تسلیم کرتی ہیں ہو کر خم۔"
ایک غزل لکھتے ہیں اب ہم، دل سے پڑھنا جانِ عالم[۱]

۱۔ امیر اللہ شاہین۔ اردو کے اسالیب نثر ص ۱۵۰

جملوں کی تنظیم تباتی ہے کہ دوسرے فقرے میں پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیے کھپائے گئے ہیں۔ القاب و آداب اور مقفیٰ بیانوں کے اہتمام میں مدعا نگاری گم ہے اور مکتوب نگاری بیگم کے دلی جذبات کے اظہار کے بجائے انشا پردازی کی قابلیت کا مظاہرہ معلوم ہوتی ہے۔

اردو میں مقفیٰ اور مسجع عبارت کے نمونے ہمیں غلام امام شہید اور خواجہ غلام غوث بیخبر کے مضامین، تقریظوں اور خطوط نیز سرسید احمد خاں کی شہرہ آفاق تصنیف آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں ملتے ہیں۔ بیخبر کے رنگ انشا کو قدیم اور جدید اردو نثری اسلوب کے درمیان کی ایک کڑی باور کیا جاتا ہے۔ انشائے بیخبر کا ایک مختصر مگر نمائندہ نمونہ پیش ہے۔

مکرمی،

میرا فغاں جو اپنی نارسائی سے میرے کانوں تک نہ پہونچتا تھا۔ آپ کی عنایت سے تمام زمانے کے گوش زد ہوا۔ میرا خونابہ جگر جس کو نا پرسانی سے میرے دامن کے سوا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ آپ کی توجہ سے ایک عالم کا روشناس بنا۔ میرا دائم دوست فغاں کرنے سے باز نہ آتا اور میرے ناسور جگر سے ہمیشہ خونابہ ٹپکا کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی جو فغاں لب سے نکلے آپ کے کانوں تک پہونچے اور جو خونِ جگر سے آپ کی نظر سے گزرے۔ یہ خواہش بھی میرے دل میں آپ کی قدردانی کی نظر سے پیدا ہوئی۔ [۱]

بیخبر۔ غالب کے ہم عصروں میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نثر کے اس نمونے میں سادگی کا میلان اور نیم مکالماتی انداز ملتا ہے اور خط القاب کی گراں باری سے آزاد

---

[۱] غلام غوث بیخبر — انشائے بیخبر مرتبہ انتظام اللہ شہابی ص ۶۶

لیکن پر تکلف الفاظ و تراکیب کا پردہ مدعا یا مواد پر حائل ہو جاتا ہے۔ ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے عہد میں اردو نثر کی زبان آرائشی اسلوب سے متاثر تھی اور نجی خطوط میں بھی انفرادیت کی گنجائش ابھی پورے طور سے نہیں ابھری تھی۔ تقریظوں میں کتاب کے نفس مضمون کے بجائے ادیب کے حسنِ اخلاق اور علم و فضل کے بارے میں حاشیہ آرائی کا مطالبہ عام تھا۔ چنانچہ غالب نے جو چند تقریظیں اور دیباچے مختلف کتابوں کے لیے لکھے تھے وہ اسی انداز کے ہیں۔ حالی نے اس سلسلہ میں یوں وضاحت کی ہے کہ "صاحبِ کتاب جو مرزا کی تحریر کو اپنی تصنیف میں شامل کرنے کے خواہش مند تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہیں تھے"۔ چنانچہ غالب نے اپنے زمانے کے مقبول عام اسلوب میں عبارت آرائی کے آداب برتے۔ نمونے کے لیے ہم تقریظ برگلزار سرور سے ایک مختصر عبارت پیش کرتے ہیں۔

ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک! سرورِ سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شناسائی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے۔

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں ایک تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے — ہے قلم اک ابرِ گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان اور شوخیِ تحریر میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوی کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا، یہ وہ تحریر ہے۔ کیا ہوا اگر ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ نقاش بے معنی تصویریں بنا کر بہزاد کا دعویٰ کرے، کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویریں کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے کس طرح...

اسی طرح عبدالرزاق شاکر کو بھی اردو میں خطوط نگاری کی اسی قسم کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

> بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے .... کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامہ لکھا کرتا ہوں [1]

بڑھاپے نے فارسی انشا پردازی کے نازک معیار کو برقرار رکھنے میں ساتھ نہیں دیا تو وہ اردو نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن دوسری توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ فن شاعری میں آئینہ وداں وصورت معنیٰ نمودن کے بعد ان کا تخلیقی جوہر نثر کی طرف مائل ہوا۔ جہاں فطری اور بے تکلف اظہار گویا ان کا منتظر تھا۔ پختگی کے اس دور میں اردو سے یہ رغبت بغاوت اور ندرت پسندی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ اسلوب عام روش کے خلاف ایک فطری صحت مند ردعمل کا درجہ رکھتا ہے۔

غالب کی ادبی تخلیقی قوت جب فارسی کی شیوہ بیانی سے گریز کر کے اردو نثر کو ابلاغ کا ذریعہ بناتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت سے اسے ایک جاندار اسلوب عطا کرتی ہے۔ ان کا یہ انداز تحریر اپنے زمانے کے مروجہ اور سادہ اسالیب نثر سے کسی قدر مشابہت رکھنے کے باوجود ایک نیا اسلوب تھا۔ جس میں فن کار کے جذبے اور ذہن کی شگفتگی نے اسے ایک نیا رنگ دیا۔ اپنی شاعری کے ضمن میں غالب کو برابر زمانے سے یہ گلہ رہا کہ انھیں شعر کی معنویت اور حسن بیان کی خاطر خواہ داد نہیں مل سکی۔ لیکن اردو نثر کے سلسلہ میں معاملہ

---

[1] خطوطِ غالب   مہر   ص ۵۲۹

برعکس نظر آتا ہے جس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے جو منشی شیو نرائن آرام کے نام ہے

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ
ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر
سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس
سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے تعلقات اوروں پر ظاہر ہوں
خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔ ۱۹ نومبر ۱۸۵۸ء[1]

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام اس زمانے کے ایک خط میں بھی اس امر پر زور دیا ہے

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد
نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو
اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء[2]

اس میں شک نہیں کہ ابتداً غالب نے ان سرسری تحریروں کی اشاعت کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھا۔ ان کی رائے میں وہ باتیں جو بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ دوستوں کو مخاطب کر کے کی گئی ہیں دوسروں پر ظاہر نہیں ہونی چاہئیں کہ یہ اقدام مصلحت کے سراسر خلاف ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ در پردہ انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ یہ خطوط اپنے انفرادی اسلوب کی وجہ سے اردو نثر میں ناقابلِ فراموش اہمیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مصلحت کو نظر انداز کرتے ہوئے خطوط کے نفسِ مضمون کو عام کرنے کی اجازت دے دی۔ اور اس کے بعد ان کی اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے ذاتی دلچسپی کا بھی اظہار کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں وہ علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب

۱؎ خطوط غالب مہر ص ۱۶۹ ۲؎ خطوط غالب مہر ص ۲۴۲

میرے مسودات اردو کے تبع کرنے کو اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے

ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف وجوانب سے بھی فراہم کیے

ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا وہاں بھیج دیا

یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر اُن کا ایک

پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دوگے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے

والا ہو اور اس کو دوگے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا

جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہوگے۔" [1]

علائی کے جواب سے تشش و پنج کا اظہار ہوتا ہے تو انھیں مکرر لکھتے ہیں۔

میرے اردو خطوط کے ارسال کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا تمہارے

حسن طبع پر اس سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزا ہوا ....

سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمہارے

منافی طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا اور اگر ان کے تلف ہوجانے

کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی

متصدی سے نقل اتروا کر جا ہو کسی کے ہاتھ چا ہو بسبیل پارسل

ارسال کرو" [2]

۲۰ر اکتوبر ۱۸۶۸ء عود ہندی، مجموعۂ مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔

جس کے چار ماہ بعد مکتوب نگار دنیا سے رخصت ہوگیا۔ تاہم اس کی زندگی میں ان نجی

خطوط کی اشاعت ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالتی ہے جو روشن خیالی اور حقیقت پسندی

پر مبنی ہے۔ یہ خطوط اپنے لکھنے والے کی ذہنی تصاویر کو تمام و کمال پیش کرتے ہیں۔ خیریت طلبی

---

[1] خطوط غالب مہر ۹۴ [2] خطوط غالب مہر ۹۴

اور خیریت رسانی کی رسمیات سے قطع نظر ان میں مکتوب نگار نے اپنے ادبی عقاید، عصری حقائق اور ذاتی زندگی کی سرگزشت بیان کی ہے اور انسانی دردمندی کے تحت اپنے مخاطب کی زندگی کے معاملات سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں عام کاروباری معاملات بھی ہیں اور نظریۂ شعر سے متعلق باریک اصولوں پر عالمانہ مباحث بھی۔ کہیں اپنی ذات پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہوتا ہے تو کہیں بخت کی نارسائی پر حزن و تاسف کی گہری لکیریں ہویدا ہیں۔

ان خطوط میں وہ اپنے دور کے کوائف و احوال غیر جذباتی انداز کے ساتھ تفصیل سے قلم بند کرتے ہیں تو دوسری طرف دلی کی شاندار تہذیب کی نشانیوں کے مٹنے اور معتبر شخصیتوں کی عبرتناک داروگیر پر کف افسوس ملتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں نجی زندگی کی سچی روداد بیان کی ہے اور اپنی شراب نوشی اور تنگ دستی کا پورا احوال بغیر کسی حزم و احتیاط کے سنایا ہے۔ ایسے خطوط کی اشاعت کی اجازت وہی شخص دے سکتا ہے جس کا اعتقاد ہو کہ انسانی سیرت کے تانے بانے نور و ظلمت کے تاروں سے گندھے ہوئے ہیں اور انسان کو صرف فرشتہ یا صرف شیطان سمجھ کر اس کی سیرت کا خاکہ کرنا اپنی کم نگہی کی دلیل ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت غالب عوام و خواص کے روبرو اپنی ذات کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنا تقاضائے بشریت سمجھتے ہیں۔

اگر خطوط غالب کی غیر معمولی اہمیت پر ایک جملہ میں تبصرہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک حقیقی فن کار کی وہ دانش و بینش عکس ریز ہے جو پختگی کی عمر کا حاصل سمجھی جاتی ہے۔ زندہ اسلوب کی اپنی آواز ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم خطوط غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس آواز کو سنتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم شروع سے اس آواز کی شناخت کرتے چلیں[۱۳] تاکہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو۔

غالب کے یہاں تحریر زبانی گفتگو کے قائم مقام ہے۔ وہ خط کو رقعۂ داستان، کہانی اور خبر نامے کے مترادف قرار دیتے ہیں

- آج یہ رقعہ تمکو لکھتا ہوں۔
- میرا رقعہ تمہارے نام کا اور تفتہ کا رقعہ تمہارے نام کا حسب الحکم تمہارے واپس بھیجا جاتا ہے۔
- تم جو مولانا علائی کو خط لکھو تو یہ رقعہ ملفوف کرو۔
- یہ جو رقعہ لے کر پہونچتے ہیں ان کا نام حسن علی ہے۔

قطعی طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ رقعہ کا لفظ انھوں نے عام کاروباری یا مختصر خطوط کے لیے استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ مرزا یوسف کے نام ۲۶ جولائی ۱۸۵۹ء کو جو مفصل خط لکھتے ہیں اس میں یہ لفظ موجود ہے۔

حسین مرزا صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ رقعہ پڑھا دینا۔

تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا غالب نے اپنے خطوط میں لفظ رقعہ کا استعمال تقریباً ترک کر دیا اور پھر اس لفظ کے بجائے دوسری اصطلاحات مثلاً خبر، کہانی اور داستان خط کے مفہوم کو وسیع تر حدود میں داخل کرتی ہیں۔ چنانچہ مکتوب نگار منشی ہرگوپال تفتہ کو اطلاع دیتا ہے۔

صاحب، ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تمکو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔[۱]

میر مہدی مجروح کے نام

"میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو ادھر آؤ خبریں سنو۔[۲]

علاء الدین علائی کے نام ان کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

صاحب، میری داستان سنیے۔[۳]

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۷۵ ۲ خطوط غالب مہر ص ۲۸۷

۳ خطوط غالب مہر ص ۵۰

اور انہی کے نام ایک دوسرے خط میں بھی مکتوب کو کہانی کا قائم مقام قرار دیا ہے :

میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں [۱]

اس کے علاوہ متعدد خطوط میں بھی یہی سننے اور سنانے کا انداز ملتا ہے۔ اس ذیل میں مرزا تفتہ کے نام خطوط خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً

آؤ میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ بیٹھو اور میری حقیقت سنو[۲]۔

یا

سنو میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ [۳]

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

بھائی، میرا ذکر سنو [۴]

اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام خطوط میں بھی اس طرح کے جملے اکثر ملتے ہیں۔

سنو، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ [۵]

یا

میری جان، سنو داستان [۶]

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں خط صرف خیر و عافیت کی رسم کو نبھانے کے لیے نہیں لکھے گئے بلکہ یہ مکتوب نگار کی اس آرزو کی تکمیل ہے کہ وہ مخاطب کو مکتوب نگار

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۹۱ ۲ خطوط غالب۔ مہر ص ۲۰۰۔ ۳ خطوط غالب مہر ص ۱۹۱
۴ خطوط غالب۔ مہر۔ ص۔ ۳۰۱۔ ۵ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۷۱۔ ۶ ۔ ۔ ۲۰۶

کی زندگی کے احوالِ واقعی کا محرم بنائے تاکہ لطف و انبساط کی کیفیت جو اس تحریر کا حاصل ہے، دونوں ہستیوں کو اپنے حصار میں لے لے۔

خطوط کے اِن متماثل مفاہیم و معانی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ نامہ نگاری غالب کے لیے ایک نفسیاتی ضرورت بن چکی تھی۔ خاص طور سے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد شہر دلی سیاسی انتشار، اقتصادی ابتری اور عام سماجی افراتفری کے نرغے میں تھا اور غالب اپنے ہی شہر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے پر مجبور تھے تو انھیں خطوط میں اپنی تنہائی کا نعم البدل نظر آیا۔ دوست و احباب کہاں سے میسر آتے جبکہ شہر کی فضا اپنے حال و مستقبل کے بارے میں بے یقینی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گرفتاریاں اور خانہ تلاشیاں بڑے پیمانہ پر جاری تھیں غدر کے فرو ہو جانے کے بعد عرصہ تک عوام و خواص آزادی کے ساتھ شہر دلی میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس عالمِ تنہائی کا مداوا انھوں نے خطوط میں جس طرح چاہا وہ کچھ یوں ہے۔

بھائی، مجھ کو اس منسیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے![1] مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو

---

[1] ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے کہ اس پُر آشوب زمانے میں ان کی اور اُن کے خاندان کی زندگیوں کا محفوظ رہنا اسی حفاظتی دستہ کی بدولت ممکن ہوا جو مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں کی حفاظت کے لیے مامور کیا تھا۔ خطوط غالب مہر۔ ص ۲۲۲

کہ کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس
دو چار لوگ نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور
بال مکند اس کا بیٹا، یہ دونوں شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس
سے گزر کر لکھنو اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے
رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح
ہیں۔ وہ آمد خط کی موقوف صرف تم تین صاحبوں[1] کے آنے کی توقع
اس میں دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینہ میں ایک
دو بار مہربانی کرتے ہو۔[2]

داستان، کہانی اور خبرنامے ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے خطوط مطلب نویسی اور اظہارِ معنی کا جاندار مرقع ہیں۔ ان کی جدت پسند اور تنوع پرور طبیعت کو آرائشی عبارت آرائی سے گراں بار روایتی انداز گوارہ نہ تھا۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ایک خط میں اس طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے جب
مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔[3]

مگر یہ مطلب نویسی مجرد اور سپاٹ نہیں ہے بلکہ ان میں گفتگو کی بے ساختگی اور کشش انگیزی ایک غالب عنصر کی حیثیت سے محیط ہے۔ مروجہ متصدیانہ اور منشیانہ مراسلہ نگاری سے گریز کر کے انھوں نے اپنی ڈگر اسی طرح نکالی جس طرح عموماً شاعری کے میدان میں وہ انفرادی امتیاز قائم کر چکے تھے۔ مراسلے کو مکالماتی انداز میں ڈھالنا ایک فن ہے جسے انھوں نے

---

[1] مراد منشی نبی بخش حقیر، مولوی قمرالدین خاں اور تفتہ۔
[2] خطوط غالب، مہر ص ۱۵۱ [3] خطوط غالب مہر ص ۵۱۲

بے تکلفی کے ساتھ برتا۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کے خط میں دعویٰ کرتے ہیں۔

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔
ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے
لیا کرو۔ [1]

ایک دوسری جگہ نواب انورالدولہ شفق کے نام مکتوب میں اسی طرف یوں اشارہ ہوتا ہے

اب میں حضرت سے باتیں کرچکا۔ خط کو سرنامہ کرکر کہار کو دیتا ہوں
کہ ڈاک میں دے آوے۔ [2]

اس طرزِ تحریر کے متعلق شفق ہی کے نام ایک دوسرے خط میں واضح تر بیان موجود ہے

یہ خط لکھنا نہیں ہے۔ باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں
القاب و آداب نہیں لکھتا۔ [3]

غالب کو تحریر میں تقریر کا انداز محبوب تھا۔ اس طرزِ نگارش کو نہ صرف انھوں نے اپنے خطوط میں اپنایا بلکہ وہ متواتر اس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ مرزا تفتہ کی تحریر کی ان الفاظ میں تحسین کی ہے۔

زیادہ خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پردا
دے دیا تھا۔ [4]

غالب کی جدّت پسندی اور مکالمہ طرازی دوسرے لوگوں کے خطوط میں بھی یہی وصف دیکھنے کی خواہشمند ہے۔ چنانچہ وہ مرزا حاتم علی مہر کی رسمی خط و کتابت پر شوخی اور اور استہزا کے ملے جلے انداز میں یوں گرفت کرتے ہیں:

---

[1] خطوط غالب مہر ص ۲۱۹ [2] خطوط غالب مہر ص ۳۵۳
[3] خطوط غالب مہر ص ۳۵۴ [4] خطوط غالب مہر ص ۳۶

اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعات عالمگیری یا انشائے[۱] خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں پسند آ جایا کرے وہ خط میں لکھ لیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔[۲]

ان چند جملوں میں بے معنیٰ لفاظی اور بےجان تحریر کے خلاف غالب کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ خطوط نویسی کے روایتی انداز کو ترک کر کے مکتوب نگار نے اپنے ذوق لطیف سے جو مخصوص انداز اختیار کیا ہے وہ اس کی اہمیت سمجھتا ہے۔ میر مہدی مجروح کو غالب کے خط میں کچھ کمی نظر آتی ہے تو ان کو شکوہ سنجی کے جواب میں نہایت اعتماد کے ساتھ قائل کیا جاتا ہے۔

تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت[۳] ہے

۱۔ ہندوستان میں فارسی زبان عرصہ دراز تک تہذیب و ثقافت پر چھائی رہی۔ اس لیے فارسی مکتوب نگاری کے اسلوب کو ذوق و شوق کے ساتھ اپنایا گیا۔ امیر خسرو کے "اعجاز خسروی" کو ترسیل کا ممتاز مدایت نامہ قرار دیا جاتا ہے ابوالفضل کے خطوط میں رنگینی کے بجائے ایک قسم کی پیچیدگی کا رجحان ملتا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی فارسی میں متعدد خطوط نویسی کے نمونے ملتے ہیں جن میں سے دو (رقعات عالمگیری اور انشائے خلیفہ) کا ذکر غالب نے اپنے اس خط میں کیا ہے خطوط نویسی کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں "مگر تہذیب میں تکلف کا رنگ جتنا جتنا بڑھتا گیا اسی قدر خطوط میں بھی تکلف اور رنگینی کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ طویل سرنامے لمبے القاب و آداب طرز تخاطب میں بناوٹ اور تصنع اور "دفتریت" کے انداز نمایاں ہوتے گئے جن کا خاتمہ اس اسلوب پر ہوا جس کو غالب نے "محمد شاہی روشوں" کا نام دیا ہے [میر امن سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ صفحہ ۲۷۰ - ۲۷۱]۔

۲۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۴ - ۲۲۵۔

وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہونچا۔ جی
خوش ہوا ...... کیوں سچ کہیو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی
یا اور؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ وہ خط ہی نہیں
ہے۔ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ
بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو
ہم زندہ ہیں ...... اگر تمہاری خوشنودی اس طرح کی نگارش پر منحصر
ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ [۱]

غالب کو اپنے خطوط کی انفرادیت کا پورا احساس تھا۔ جب انھوں نے جنون کو واضح کیا
تھا کہ وہ بندھے ٹکے اصولوں کے مقابلے میں مطلب نویسی کو اولیت دیتے ہیں تو گویا وہ اس
کے اسلوب کو زیادہ وقیع اور جاندار بنانے کے حق میں تھے۔ ان کی بلند قامت شخصیت اپنے
خطوط کی مقبولیت پر انبساط اور افتخار کے اظہار میں مضائقہ نہیں سمجھتی۔ میر مہدی مجروح
کے خط میں مکتوب نگار نے اپنے اور میر مہدی کے درمیان جو مکالمہ ترتیب دیا ہے
اس کے آخری حصہ میں یہ احساس موجود ہے۔

کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا
جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں
چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی
کے تین دن بعد آپ شوق سے خط لکھیے گا۔ [۲]

مکتوب نگار کی فکری شادابی خط کو نئے اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر اسے فن کا ایک
نادر نمونہ بنا دیتی ہے۔ اس کی مخصوص فطرت جس نے اسے عنفوان شباب اور اس کے بعد

---

[۱] خطوط غالب۔ مہر ص ۳۰۰۔ [۲] خطوط غالب مہر ص ۲۹۵

کے دور میں شاہراہِ عام پر چلنے کے بجائے اپنی راہ بذاتِ خود تعمیر کرنے پر اکسایا تھا۔ اس نثری اسلوب میں بھی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہے اس ضمن میں ہم سب سے پہلے القاب و آداب کو لیتے ہیں۔

غالب نے ایک خط میں تذکرہ کیا ہے کہ وہ القاب و آداب نہیں لکھتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے فرسودہ القاب و آداب سے گریز کیا تھا جو اس زمانے میں صرف اس لیے ہر خط کے آغاز میں لکھے جاتے تھے کہ انشاپرداز انھیں لازم قرار دیتے تھے۔ غالب نے اس رسم کو ہنرمندی کے ساتھ برت کر اس میں بے تکلفی اور اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بہت سے خطوط بغیر القاب کے براہ راست گفتگو کے انداز میں شروع ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے قدیم القاب و آداب کو یکسر رد نہیں کیا بلکہ تھوڑی ترمیم و تنسیخ کے بعد ان کو بھی اپنے خطوط میں استعمال کیا ہے۔ دراصل مکتوب الیہ کی شخصیت انھیں تصور میں اپنے لیے ایک مخصوص خطاب فراہم کرنے پر اکساتی ہے۔ چنانچہ یہ القاب بھی حفظ مراتب کے لحاظ سے وضع ہوتے ہیں اور کبھی کسی صورت حال کے تاثر کے نتیجے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر یہ طرز تخاطب مکتوب نگار کے دلی لگاؤ کا بے ساختہ اظہار بن کر خط کی فضا کو منور کر دیتا ہے جن ہستیوں کا احترام مقصود ہے انھیں پیر و مرشد قبلۂ حاجات، خداوند نعمت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً صاحب عالم مارہروی کے لیے دو خطوط میں عقیدت مندانہ عجز کے ساتھ یہ القاب وضع ہوئے ہیں

> حضرت صاحب قبلہ و کعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسد اللہ کی بندگی۔

یا

> بعد حمد خدا و نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے قبلۂ روح و روان جناب صاحب عالم کو بندگی

نواب میر غلام بابا خاں کے لیے دو القاب یوں ہیں۔

ستودۂ ہر زباں و نامور ہر دیار نواب صاحب شفیق کرم گستر مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خاں بہادر عالی شان والا دودمان زاد مجدکم۔

میر حبیب اللہ ذکا جو مکتوب نگار سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ انھیں اس طرح مخاطب کیا ہے۔

اے عنایت بہ عنایت ہمہ کل

میرے مشفق میرے شفیق مجھ سے ہیچ پوچ کے ماننے والے مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے میرے محب میرے محبوب۔

دوست روحانی و برادر ایمانی۔

جاناں بلکہ جاں

بے تکلف احباب اور شاگردوں کے لیے جن سے انھیں دلی تعلق ہے کبھی سرے سے القاب نہیں ہوتا اور کبھی میاں، برخوردار، بھائی صاحب، سید صاحب، مرزا، کیوں صاحب وغیرہ طرح طرح کے القاب ایجاد کرتے ہیں۔ مثلاً

علاء الدین خاں علائی کے لیے

میری جان، جان غالب کے علاوہ یار بھتیجے گویا بھائی۔ مولانا علائی اقبال نشاں۔ جانا عالی نشانا۔ جان غالب۔ جانا جانا!

اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے لیے

مہاراج۔ جان من و جانانِ من۔ دیکھو صاحب۔ اجی مرزا تفتہ منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی ہرگوپال تفتہ۔ میرے مہربان۔ مرزا تفتہ سخندان۔

ایک جگہ تفتہ کو شغل مے نوشی کی وجہ سے ازخود رفتہ مرزا تفتہ بطور تفنن طبع کہا ہے اور کبھی نور نظر لخت جگر کہہ کر شفقت کا احساس جگایا ہے۔ جب مکتوب الیہ کے لیے جوش محبت فزوں ہوتا ہے تو ـــــــ کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ یعنی میرزا تفتہ کا خطاب رونمائی کرتا ہے۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھنے بیٹھتے ہیں تو مختصر اور طویل دونوں طرح کے القاب استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ـــــــ سید صاحب، میاں، سید، بھائی میاں لڑکے کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔

اور کبھی خوبیٔ دین و دنیا، مار ڈالا یار برخوردار کامگار میر مہدی کیوں کیوں یار کیا کہتے ہو، میاں لڑکے آ یا ہا ہا، اور میاں سید زادہ آزادہ ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو؟ ـــــــ جیسے طویل تر خطاب ایجاد کرتے ہیں۔ اسی طرح منشی شیونرائن آرام کو کبھی برخوردار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو کبھی میاں کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور نظر لخت جگر، مہاراج یا صاحب کہہ کر بھی پکارتے ہیں منشی شیونرائن آرام کے نام ایک خط یوں شروع ہوتا ہے

شفیق میرے مکرم میرے شیونرائن صاحب

تم ہزاروں برس سلامت رہو۔

یہاں صرف دعا ہی نہیں بلکہ میرے شفیق اور میرے مکرم کے بجائے شفیق میرے اور مکرم میرے کی ترکیب نے اپنائیت کا ایک دوسرا ہی لہجہ اختیار کر لیا ہے۔ بے تکلفی کی لہر واہ حضرت بھائی صاحب کے سیدھے سادھے القاب میں داخل ہو کر اس میں اپنائیت پیدا کرتی ہے۔ لیکن غالب اس سادگی میں بھی کسی ایک طرز کے پابند نہیں رہتے۔ وہ معرب، مفرس اور قدیم القاب بھی اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں اجنبیت کی بو باقی نہیں رہتی۔

مثلاً قرۃ العین میر غلام حسنین سلمہ اللہ تعالیٰ

یا میر مہدی کے لیے برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی۔

یا علائی کے واسطے نیرِ اصغر سپہر سخن دانی، ــــ کے القاب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اسی ذیل میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان ریاست رامپور کے نام خطوط اس القاب سے شروع ہوتے ہیں

· حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت

البتہ دو خطوط میں صرف جناب عالی اور ایک میں خداوند نعمت استعمال ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں حفظ مراتب کا لحاظ اور حاجت روائی مقصود ہے جس کی وجہ سے یہ خطوط کاروباری اور استمدادی نوعیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس مجبوری کے باوجود غالب کا یہ طرز تخاطب زمانے کے رواج اور مطالبہ کے مقابلہ میں زیادہ راست اور تصنع سے پاک ہے نوابین کے تخاطب کا یہ تضاد سماجی حقیقت کا مظہر ہے

بے تکلفی کے علاوہ غالب کے القاب میں مخاطب کے ذہنی اور علمی معیار کا لحاظ بھی مد نظر رہتا ہے۔ اس ضمن میں غالب نے والیان رام پور اور نواب انورالدولہ شفق کے نام جو مکتوبات تحریر کیے ہیں، ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھا تھا۔

مرزا صاحب،

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو [۱]

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۱۹

خطوط غالب کے مخصوص خدوخال کے تعین کے ضمن میں ان جملوں کے حوالے کے بغیر بات کبھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمے کی شکل دے کر اس میں گوناگوں خصوصیات پیدا کی ہیں۔ خطوط میں گفتگو کا لب ولہجہ پیدا کرنے کی ضرورت دراصل مزاج سے رفاقت کی خواہش کا اظہار ہے۔ غالب "حریفِ لذتِ آزار" ہی نہیں حریص لذتِ گفتار بھی معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ مکالمہ نگاری دراصل تخیل کے لمحۂ ملاقات کو رواں دواں اور مجسم کرنے کی سعی کے مترادف ہے۔ مکتوب نگار مرزا تفتہ پر یہ راز ان الفاظ میں آشکار کرتا ہے۔

> تم سمجھے؟ میں تمہارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی بیگ صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے۔ اور اب کیا دیر ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے۔[۱]

کبھی یہ نیم ملاقات بھی ان کی تشنگی کو بجھانے سے قاصر رہتی ہے اور یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ مکالمہ دراصل مکمل گفتگو کا بدل نہیں بن سکا۔ بلکہ صرف یک طرفہ اظہار بن کر رہ گیا ہے۔ اس احساس کا اظہار منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں اس طرح ہوتا ہے۔

> آج آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو۔ یہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں جو زبانی مکالمے میں ہوتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا

۱؎ خطوط غالب مہر ص ۱۹۶

ہوں۔ تم کچھ نہیں کہتے۔ وہ بات کہاں کہ میری بات کا تم جواب دیتے جاؤ اور تمھاری بات کا میں جواب دیتا جاؤں۔ [۱]

اس کے باوجود غالب کے نزدیک یہ ادھوری گفتگو بھی ملاقات کی لذتوں کی حامل تھی۔ جس نے ان کے احساسِ تنہائی کا مداوا کیا۔ تفتہ کو بڑے درد سے لکھتے ہیں۔

میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں

بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کو پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ [۲]

دو افراد کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہوتا ہے تو اس میں بڑی بے تکلف کی فضا نمود کرتی ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں بے تکلفی کا حسن پیدا کیا ہے۔ مرزا تفتہ، علاء الدین خاں علائی، میر مہدی مجروح، حاتم علی مہر، منشی شیو نرائن آرام اور دوسری ہستیوں کے نام جو خطوط ہیں ان میں بے تکلفی کے ساتھ احساس کا جو تنوع جھلکتا ہے وہ ایک لطیف رنگ پیدا کرتا ہے۔ میر مہدی کو کس بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔

کیوں یار، کیا کہتے ہو۔ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک ۔۔۔ آتش شوق تیز تر گردد [۳]

---

[۱] نادراتِ غالب ص ۲۵-۲۶۔ [۲] خطوطِ غالب مہر ص ۱۷۱

[۳] خطوطِ غالب مہر ص ۳۶۷

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط اس انداز سے شروع ہوتا ہے

کیوں صاحب ،

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟ اور اگر کسی

طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو ۲

اپنائیت سے بھرپور یہ صدا مکتوب الیہ کے در گوش پر دستک دیتی ہے غالب کے خطوط میں بے تکلفی کا یہ رنگ جا بجا جھلکتا اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہوتا ہے کیونکہ اس آواز میں خلوص کی لہر موجزن ہے۔ یہ بے تکلفی ایک خوش طبع انسان کا ردّعمل ہے جو شگفتگی کی آمیزش سے اپنی تحریر میں ایک قسم کا خوبصورت توازن قائم کرتا ہے کہیں بے تکلفی خط کی ابتدا میں ہوتی ہے اور کہیں اختتام پر جیسے میر مہدی کے نام ایک خط میں

اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک

خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزہ ملا تو دونوں کا جواب

ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں ۲

غالب بذاتِ خود جو مکتوب نویسی کے دل دادہ ہیں کبھی میر مہدی کے جواب خط کے شکوے پر تجاہل عارفانہ سے کام لے کر یوں چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔

تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات

لے بیٹھے اگر خط پہنچا ہے تو جواب ، ورنہ شکوہ و شکایت

وعتاب و خطاب لکھنے لگے ۳

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۸۱

۲۔ ص ۲۷۹

۳ ص ۲۹۲

اپنائیت اور اعتماد کا یہ احساس اسلوب کے اندر اس دلآویزی اور پرکاری کو جنم دیتا ہے جو ایک پرجوش شخصیت کے قلم کا ثمر کہلاتا ہے۔ غالب کے ذہن کی تازگی خط کی دنیا کو اپنے حوصلے کے مطابق شاداب بنانے کا ہنر جانتی ہے۔ خط کا اسلوب ان کی زندگی کے تنہا شب و روز میں ایک حیات بخش مشغلہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں، عقیدت مندوں اور مربیوں سے اپنی زندگی کے دکھ درد اور عصری احوال کی بے یقینی پر تبصرہ کر کے اپنے ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ اور مکتوب الیہ کے رجحان کے لحاظ سے علمی مسائل پر سیر حاصل گفتگو بھی چھیڑتی ہے۔

بے تکلفی میں روزمرہ اور محاورے بے ساختہ زبان پر آتے ہیں۔ میر مہدی کے اس خط میں ہم دیکھتے ہیں۔

میری جان،

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ۔
صبر و تسلیم رضا و توکل شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ
اس کو کون سمجھے گا۔ جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ ۱

دراصل بے تکلفی کا تقاضہ ہے کہ مخاطب کو اپنائیت کے احساس [illegible] جار کیا جائے۔ علاء الدین خاں علائی کو خط نہ لکھنے کی فہمائش کے ساتھ آخر میں اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں تو "تو" کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ ان کی تعزیت
آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہوئے کل ان کی چھٹی

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۲

ہوگئی۔ آپ شریک نہ ہوئے

اے وائے ز محرومیٔ دیدار، دگر، ہیچ

میاں، خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں[1]

طرز تخاطب کی بے تکلفی نے خطوط میں زور، روانی اور انفرادیت کے محاسن پیدا کئے ہیں۔ کبھی یہ بے تکلفی امر کے صیغہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسے غلام نجف خاں کے نام ایک مختصر سے خط میں ہم دیکھتے ہیں۔

سنو،

میری عرض مانو،

تقصیر معاف کرو، بھائی انصاف کرو۔ زیادہ توجہ فرماؤ

معالجہ کرو،[2]

فرمائش، سفارش اور درخواست کا یہ لہجہ نہ صرف بے تکلفی کا مظہر ہے بلکہ خوبصورتی کے ساتھ مکتوب نگار کے نفسیاتی تحفظ کی بھی نشاندہی کرتا ہے، مکالمہ کی یہ بے ساختگی اور لہجہ کی صداقت غالب کے خطوط کی جان ہے اور ان کے اکثر مکتوبات میں ملتی ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام ایک اور مختصر خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

میاں،

آج صبح کو تم آئے تھے۔ میں اس کمٹ کے قصے میں

۱۔ ص ۹۵-۹۶

۲۔ ص ۳۸۲

ایسا الجھا کہ تم سے کہنا بھول گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱

یا میاں،

تمھارا گلا میرے سر و چشم پر، لیکن میرا حال سن لو اور اپنے وہم و قیاس پر عمل نہ کرو۔ ۲

اسی طرح بات چیت کا یہ انداز علاء الدین خاں علائی کے نام اس خط میں دیکھیے جس میں خود کلامی کا عنصر شامل ہے۔

میری جان،

سُن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس اتوار گیارہ، ایک مژہ برہم زدن مینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ ۳

مجروح کو ایک دوسرے خط میں یوں خطاب کرتے ہیں

میری جان تو کیا کر رہا ہے

یا مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے

بے تکلفی کا یہ انداز خطوط کے آغاز ہی تک محدود نہیں بلکہ ایک ہی خط میں وقفہ کے ساتھ اس کی تکرار بھی ملتی ہے۔ مثلاً میر مہدی کے نام مذکورہ بالا ایک ہی خط کے مختصر حصوں میں یہ جملے خلوص کی جوت جگاتے ہیں۔

بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں

ارے میاں، تم نے کچھ اور بھی سنا

---

۱. خطوط غالب مہر ص ۳۸۲

۲. ص ۳۷۰

۳. ص ۷۷

"بھئی اب تم جاؤ۔ بیٹھے رہو یا جاؤ اپنے گھر میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں" ۱

اسی طرح حکیم غلام نجف خاں کے نام ایک مکتوب میں یہ جستہ جستہ جملے بے تکلفی اور اپنائیت کے آئینہ دار ہیں ۔

بھائی میرا دکھ سنو
تجھ کو میری جان کی قسم،
اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا ۲

مکالمے کا یہ انداز صرف جملوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ بعض اوقات مکالمہ در مکالمہ کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے ۔ جیسے میر مہدی کے نام ۲۲ دسمبر ۱۸۵۹ء کے خط میں اپنی ہوئی دل کے پر درد تذکرے کے بعد میر سرفراز حسین، اشرف علی، نصیر الدین کو دعائیں اور اشتیاق دیدار کے بعد میرن صاحب کے نام مزاج پرسی اور پیام جس کا انداز جدت آمیز اور ناقابل فراموش ہے ۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے ۔ حضرت آئیے ۔ سلام علیکم، مزاج مبارک کہیئے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں، اگر بھیجا ہے تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ میں کہیں تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا

۱- خطوط غالب مہر ص ۲۸۲
۲ ص ۳۰۳

کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ
جب ایک جا ہوں گے تو انتقام لیا جائے گا ۲

ان چند جملوں میں مکتوب نگار نے زمان و مکان کے فصل کو جس طرح منظر نامہ میں تبدیل کیا ہے وہ مکالمہ کی معراج ہے۔

مکالمہ کی یہ رسائی اور گیرائی میر مہدی مجروح ہی کے نام ایک دوسرے خط مئی ۱۸۶۱ء میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے، جس میں میرن صاحب کی طرف سے فرمائش کی گئی تھی کہ مکتوب نگار مجروح کے نام تین دن کے بعد خط لکھے تا کہ جس وقت خط پہونچے تو وہ بھی وہاں موجود ہو۔

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم
حضرت آداب!
کہو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟"
" نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے"

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۰۲

"حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے"

"بھائی آخر وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"[1]

مرزا صاحب کا عقیدت مندانہ جواب (جو مکتوب نگار مزے لے کر بیان کرتا ہے) ہم اس سے قبل پڑھ چکے ہیں۔

غالب کے یہاں مکالمہ صرف استفہامیہ، استعجابیہ یا اطلاعاتی جملوں اور لہجہ کی آمیزش سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ یہ ایک تخلیقی ڈرامائی ذہن کی کامیاب کاوش ہے۔ مکتوب نگار کا ذہن پوری کیفیت کو مجسم کرتا ہے وہ تصور کی آنکھ سے بعض صورتِ حال کو دیکھنے اور اسے کاغذ پر مجسم پیش کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ تصور میں ان مناظر کو بلا بھیجتا ہے جو نظر سے اوجھل ہیں، اور پھر انھیں جزئیات سازی کی مدد سے زندہ بنا دیتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ تجسیم مصورانہ اور جامد نہیں بلکہ متحرک بھی ہے۔ جس میں لمحے لمحے کی لرزش اور بصری و سماعی کیفیات مجتمع کر دی گئی ہیں۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو

قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۴ - ۲۹۵؛

مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ
طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی
اور ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں، اور پیادہ پا چل دوں۔
کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ ۱

علاء الدین خاں علائی کی اپنے حالات کی بے اطمینانی کے اظہار پر مکتوب نگار خود اپنی زندگی کی خواہشات کا اعادہ کرتا ہے اور اپنے ان خوابوں کا جلوہ مکتوب الیہ کو بھی کرا دینا چاہتا ہے جس کے تعاقب میں اس نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔

غالب کا ذہن مختلف خطوط میں ڈرامائی انداز کے ذریعہ صورت حال کی ایک جیتی جاگتی صورت کو نظروں کے بالمقابل لاتا ہے۔ نواب انور الدولہ شفق کے نام ایک خط سے لیا گیا مندرجہ ذیل اقتباس بھی اسی ڈرامائی منظر نگاری کا ایک موثر نمونہ پیش کرتا ہے۔

شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرط برودت سے گزند
پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ٹھنڈی ہوا بے گزند چل رہی
ہے۔ ابر تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے پر نظر نہیں آتا۔ ۲

اکثر یہ ڈرامائی کیفیت خط کے آغاز ہی میں نمودار ہوتی ہے اور القاب ہی سے اس کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ گویا غالب آئینہ خانۂ خیال میں مکتوب الیہ سے ملاقات کا ایک منظر تصور کرتے ہیں جس کا مرکزی کردار مخاطب کے ہونے کے باوجود خود مکتوب نگار کی ذات ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان محفل آرائی کی کیفیات لکھنے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۰
۲۔ " " ص ۳۶۱

والے کے ذہن سے جاری و ساری ہوگئی ہیں۔ نواب انورالدولہ شفق کے نام ایک مکتوب کی ابتدائی سطور میں کچھ اسی قسم کی کیفیت ملتی ہے۔

حضرت پیر و مرشد،

اگر آج میرے سب دوست اور عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے تمہیں کہتا کہ آؤ اور رسم تہنیت بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انور الدولہ کا خط لایا ہے[1]

آئینہ خیال کی یہ محفل آرائی سید یوسف مرزا کے نام اس خط کے ابتدائی حصے میں بھی ملتی ہے۔

کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلا لائیو۔ لو صاحب وہ آئے میاں میں نے کل تم کو خط بھیجا ہے۔ مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے۔ اب سن لو۔[2]

۔ پچھلے خط میں اضافے اور اصلاح کا یہ ڈھنگ خالص ڈرامائی اور جدت آمیز ہے۔ تخاطب کا یہ انداز کبھی خط کے درمیان میں جملہ معترضہ کی صورت میں بھی لایا گیا ہے، جس سے تحریر میں جان پیدا کی ہے۔ سید یوسف مرزا کو مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ کے بیٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خان، میر احمد حسین میکش،

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۹۵

۲۔ " " ص ۳۹۶

اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین مرزا، یوسف
مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان
کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے!

اس اقتباس میں "اے لو بھول گیا" کے جملے سے گفتگو کی جو بے ساختگی اور کیفیت کی جو صداقت پیدا ہوئی ہے مخاطب کے احساسات کو متاثر کرتی ہے وہ قابل غور ہے۔ یوسف مرزا کے نام ایک دوسرے خط میں بھی اسی ڈرامائی ذہن کی شہادت ملتی ہے۔ وہ یوسف مرزا کو "آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ" کہہ کر پہلے دن اور تاریخ کی وضاحت کرتے ہیں، پھر اشخاص اور حالات کی لمحہ بہ لمحہ حرکت کو خوبی کے ساتھ الفاظ میں ڈھالتے ہیں، میر کاظم علی کا تعارف ان کی خاص ہیئت کذائی کے ساتھ الور کے لئے روانگی، پھر اس دن کی چند چھوٹی چھوٹی باتیں جو سرسری ہونے کے باوجود اس لحاظ سے اہم ہیں کہ مکتوب الیہ اس نظارے میں شریک ہو جاتا ہے۔ مکتوب نگار نے تخیلی منظر کو الفاظ کے قالب میں متحرک بنا کر پیش کیا ہے۔

آؤ صاحب،

میرے پاس بیٹھ جاؤ، آج یکشنبہ کا دن ہے۔ ساتویں
تاریخ شوال کی اور ۲۹ ویں اپریل کی۔ صبح کو بھائی فضلو،
جن کو میر کاظم علی کہتے ہیں اور ہم نے انھیں احتلام الدولہ کا
خطاب دیا ہے۔ اور تین پاؤ کھجوریں اور ٹین کا لوٹا اور دو
سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۴۰۳

روانہ ہوئے .... یہاں تک لکھ چکا
تھا کہ تمہارے ماموں صاحب مع سجاد مرزا تشریف لائے
تمہارا خط ان کو دے دیا۔ وہ اس کو پڑھ رہے ہیں اور میں
یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں۔ ۱

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی اسی انداز کی آئینہ داری کرتا ہے۔ مکتوب نگار رام پور میں شاہی مہمان ہے اور نئی فضا میں جو بشاشت محسوس کرتا ہے اس میں مکتوب الیہ کو بھی شریک کرتا ہے۔

آہا ہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔
بیٹھو یہ رام پور ہے۔ دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے
وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ، شہر سے تین سو قدم
پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمہ،
آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی
ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ لیکن اتنا شیریں
کہاں ہوگا؟ ۲

اس ذیل میں مجروح ہی کے نام مئی ۱۸۶۱ء کا وہ خط بھی پیش کیا جا سکتا ہے (جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے) جس میں میرن صاحب سے ایک خیالی مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی ڈرامائی ذہن کی کارفرمائی ہے کہ کبھی کبھی غالب آنے والی خوشیوں

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۸۷
۲ " " ص ۳۰۷

کے خیال سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مسرت اور تجربے کی اس پیش بینی اور لذتیت کا احساس غالب کے مزاج کا خاص جزو ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اس عبارت میں دیکھئے۔

> دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں، کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا اور وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے اس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی ٹھنڈا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا؟ کیا صحبت ہوگی؟ ۱

غالب کے نزدیک دوست سے ملاقات انبساط کا سرمایہ اور زندگی کے ڈرامہ کا ایک دلچسپ منظر ہے اور وہ ملاقات کے اس لمحہ کو ڈرامائی انداز سے دیکھنے، برتنے اور پیش کرنے پر مجبور ہے وہ تصور کی دنیا میں مکتوب الیہ سے ایک ہی سانس میں متعدد سوالات کر کے ملاقات کا سارا رس نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ اپنے ڈرامے کے سارے اہم کرداروں کو یکجا کر لیتے ہیں۔ خط کا آغاز مکالمہ میں ہوتا ہے تو ڈرامائی انداز خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ گرمجوشی کے ساتھ استقبال، مصافحہ، معانقہ، آنکھوں میں شفقت اور انس کی لو، اور ہونٹوں پر تبسم کی لہر۔ یہ جیتی جاگتی تصویریں ہمیں متعدد خطوط میں ملتی ہیں۔

آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی! بہت دنوں میں

۱۔ خطوط غالب، مہر، ص ۲۰۷

آئے ؟ کہاں تھے ؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے ۔ میر
سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں ! میرن صاحب
خوش ہیں ؟ ۱

جملوں کا استفہامیہ انداز ڈرامائی تخیل اور خلاق ذہن ہی کی پیداوار ہے۔
منظر کشی اور ڈرامائی پیچ و خم کی ایک اور مثال علاء الدین خاں علائی کے
نام ایک خط سے بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

رات کو خوب مینہ برسا۔ صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی
ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمہاری جدہ ماجدہ
مع اپنی بہو اور پوتے کے روانہ لوہارو ہوں۔ کل آج کی روانگی
کی خبر تھی۔ برسات کا سیدا زلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا
کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا
منظر مہرا ن ہے، وہاں بیٹھا ہوا خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی
بیگ ادھر سے نکلا۔
بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں
حضرت ابھی نہیں۔
کیا آج نہ جائیں گی ؟
آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔ ۲

مندرجہ بالا عبارت میں گریز اور جملۂ معترضہ کے استعمال سے کئی خوبیاں
ایک ساتھ پیدا ہو گئی ہیں۔ موسم کی خوش گوار کیفیت واضح کرنے کے بعد یہ گریز

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۲۰۰
۲۔ ص ۹۰-۹۱

بظاہر غیر مربوط محسوس ہوتا ہے۔ جس میں علائی کی والدہ، بیگم اور بیٹے کی لوہارو روانگی کی خبر درج ہے۔ لیکن یک بیک ہمیں حسنِ توجیہ کی کامیاب شکل نظر آتی ہے کہ موسم کی تبدیلی بچے کے سعیدازلی ہونے کی دلیل ہے۔

محمد علی بیگ سے مکالمہ کی شکل میں سفر کی تیاری سے متعلق جو اطلاع ملی ہے اور اس کی جس طرح مکتوب الیہ کو ترسیل ہوئی ہے، انداز بیّن طور سے لکھنے والے کے ذہن کی ڈرامائی صلاحیتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ تصور کی تندی اور سریع الخیالی بھی ڈرامائی انداز کا ایک پرتو ہے جس کی مثال اس اقتباس میں ملتی ہے۔

> خصی گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو خدا کرے، بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میرجان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے۔ تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ [1]

علاءالدین خاں علائی کے نام دوسرے خط میں غالب میرجان صاحب سے اپنی محبت بھری چشمک کو اس طرح ڈرامائی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

> مرزا علائی،
>
> پہلے استاد میرجان کے قہر و غضب سے مجھے بچاؤ تاکہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے تصور کا مورد نہیں جانتا۔ جھگڑا ان کی

۱۔ خطوط غالب۔ مہر ص ۶۶

طرف سے ہے تم ان کی طرف سے کیوں چکاؤ۔ یعنی اگر ان کو صرف آشنائی وملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں اشفیق ہیں میرا اسلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت داری و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں مگر عمر میں چھوٹے۔ میری دعا قبول فرمائیں۔ [1]

شاعرانہ اور ڈرامائی ذہن ایک ہی قوت متخیلہ کے زیر بار احسان ہوتے ہیں۔ اس لئے تعجب نہیں اگر غالب کے تخلیقی ذہن نے ان کے نجی خطوط میں ڈرامائی رنگ و روپ دھار لیا ہے۔ چنانچہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ اگر اردو ادب میں ڈرامہ کی روایت انیسویں صدی کے وسط میں جڑ پکڑ رہی ہوتی تو غالب اس زبان کے ممتاز طربیہ ڈرامہ نگار ہوتے۔

غالب کے تخلیقی ڈرامائی ذہن کی کامیاب کاوش کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ صورت حال کی متحرک تصویر کشی کے علاوہ اشیاء، اشخاص اور واقعات کا جاندار اور رواں دواں بیان غالب کی نثر کا ایک دوسرا نمایاں اور اساسی وصف ہے۔ خط کے محدود کینوس میں مکتوب نگار نے آپ بیتی اور جگ بیتی کے روپ میں زندگی کے متنوع تجربات کو گفتگو کا عنوان بنا کر مخاطب سے ذہنی قربت کا ساز و سامان فراہم کیا ہے اور وہ اس کے روبرو ایسی تصویریں پیش کرتا ہے جو سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مکتوب نگار کا مشاہدہ تفصیلات پر حاوی ہے بالفاظ دیگر اس کی پیش کردہ تصویریں چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کی مدد سے شفاف نظر آتی ہیں۔ عام طور سے اس جزئیات بینی کا تانا بانا چھوٹے چھوٹے جملوں سے تیار

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۶۶۔۶۷

کیا گیا ہے جو سیل زماں اور حرکات و سکنات کے تنوع کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جس سے ایک متحرک تصویر مخاطب کے ذہن کے پردے پر مکمل طور سے نمودار ہوتی ہے۔ رام پور جاتے ہوئے ہاپوڑ کی سرا والا خط جو شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے نام لکھا گیا ہے اس میں سفر کا حال ان الفاظ میں ملتا ہے۔

ہفتہ کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکوہ میں رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمہارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابو گڑھ کی سرائے میں آ پہونچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط

وہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے اور پھر ڈیوڑھی
پر حلال خوروں کا مجمع، گوہ کے ڈھیر، کہیں حلال خوروں کا
بچہ ہگ رہا ہے، کہیں بیل بندھا ہوا ہے، کہیں کوڑا پڑا ہوا
ہے۔ عیاذاً باللہ خدا نہ لے جائے ایسے مکان میں۔ ۱

سطور بالا میں وسعت اور تنگی، تاریکی اور روشنی کے تضاد کو مبالغے کے ذریعہ جس طرح پیش کیا گیا ہے اس نے دونوں مکانوں کے درمیان امتیاز کو قطعیت کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔ مکتوب نگار کی نفاست پسندی بالواسطہ طور پر اشراف و اجلاف کے درمیان معاشرتی فرق کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ عربی فقرے اور ٹھیٹھ ہندی الفاظ کے اتصال نے لسانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور آخری جملے نے پورے تراشے میں مخصوص مزاحیہ اور جذباتی ردعمل کی لہر دوڑا دی ہے۔ جبلی شوخی اور ظرافت کے باوجود غالب ماضی کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے۔ وہ جب بھی ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں بیتے ہوئے دن خالص حسن اور زندگی کی حرارت کے مترادف معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطوط غالب میں ماضی کے حوالے، دردمندی، سوز اور اثر آفرینی سے مملو ہیں۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۰ء کا ایک خط جو منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے اس میں مکتوب نگار مخاطب کو ماضی کی اس بارونق محفل کی طرف لے جاتا ہے جس کی فضا حدیث دلبراں اور شعر و سخن کی دوست داری کے باعث اپنی پوری تمکنت کے ساتھ حافظہ میں روشن ہے مگر جہاں کیف و لطف و انبساط کے چھلکتے جام اب ماضی کا حصہ بن گئے ہیں۔ مکتوب نگار عجب درد سے ان گمشدہ صحبتوں اور مارس

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۸

رفیقوں کو یاد کرتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ اور کیا واقع ہوا؟

اس بلیغ جملے میں دلّی کے ابتلا و آلام کا پورا دور سمٹا ہوا ہے۔ شہر کے سناٹے کے پس منظر میں تہذیب و تمدّن کی مرتعش پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ مگر بزم رنداں کی یادد لوں سے کھرچی نہیں جا سکتی۔ مکتوب نگار کہتا ہے۔

وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم اور تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے اور تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدت کے دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی ہے اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ [۱]

آشوب روزگار کے حوالے اور صوتی تکرار نے ان جملوں کو ایک مدھم لہجہ

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۴۴

بجتا ہے جس کی وجہ سے پوری عبارت سوز میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
عصری حالات کی ابتری نے فرد کے ذہنی سکون کو اس درجہ تاراج کر دیا ہے کہ تعمیر نو کی امید معدوم ہو گئی ہے۔ بے اطمینانی کے اس ماحول میں (۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء) تفتہ ہی کے نام ایک دوسرے خط میں غم ذات کا اظہار سامنے آتا ہے۔

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں، نہ مقید، نہ رنجور ہوں، نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے۔ ۱

یہاں متضاد الفاظ کے استعمال اور دھیمے لہجہ کی صوتی تکرار سے ذہنی پژمردگی اور شکست خوردگی کا احساس ابھرتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ غالب کی انا پرستی انھیں غم دوراں سے بے نیاز نہیں کر سکی جو ان کی وسعت قلب اور انسان دوستی کی دلیل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم دوراں ان کی ذاتی رنجوری کا خاص محرک ہے وہ دلی کے شیدائی اور اس کی بربادی کے ماتم گسار تھے۔ انھیں اس کی تہذیبی و تمدنی تاراجی کی داستان از بر تھی اور اس کی جزئیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انور الدولہ شفق کو ۱۸۶۰ء کی دلی کے آلام کی طویل روداد کو سمیٹ کر یوں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۷۰

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ ۱

اس خط میں مکتوب نگار معروضی انداز میں ان ارضی و سماوی آفات پر تبصرہ کرتا ہے جو ان تین سالوں میں دلی پر نازل ہوئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں اہلِ وطن کا غیر ملکی طاقت سے ٹکراؤ جو عبرتناک انجام پر ختم ہوا اور جس کی پاداش میں عمائدین، رؤسا اور شرفا کو جان و مال و ناموس سے ہاتھ دھونا پڑا زبردست قومی حادثہ تھا۔ مکان کو مکین سے شرف ہوتا ہے۔ چنانچہ شہر دلی مایۂ ناز ہستیوں کو کھو کر بے رنگ ہو گیا۔ ابھی پر بس نہیں۔ رہی سہی کسر قحط، ہیضہ اور بخار نے پوری کر دی۔ مکتوب نگار ان مصائب کی داستان عینی شاہد کی حیثیت سے مخاطب کو لفظ بہ لفظ سناتا ہے۔ پانچ لشکروں کی یلغار جس نے تمدنی زندگی کو بری طرح روند ڈالا ہے حقیقتِ حال کو سامنے لاتی ہے، بھوکے اور پیٹ بھرے، نیز تاب و طاقت و بے طاقتی کا تضاد حوادث کی اگلی کڑیوں کو جاندار پیرائے میں منسلک

۱۔ خطوطِ غالب مہر ص ۳۵۹

لکھ رہا ہوں۔ ۱

اپنے مخاطب کو سفر کی کل کیفیت گوش گذار کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے وقت اور مقام کی تخصیص کے ساتھ گھی کی مقدار، شامی کبابوں کی تعداد اور سالن کی تفصیل نے بیان کو پرلطف بنا دیا ہے، بچے، گھوڑے، دوسرے ساتھی اور خود مکتوب نگار مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح پورے منظر کی متحرک تصویر مخاطب کے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے۔ منظر کشی میں غالب کو مہارت حاصل ہے اور وہ اسے کبھی حد درجہ اختصار اور کبھی پوری تفصیلات کے ساتھ جاندار طریقے سے پیش کرتے ہیں ایک مختصر تراشہ دیکھئے۔

> بارہ بجے تھے میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا۔ پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ ۲

اس جاندار منظر کشی کے زیادہ مسلسل اور وسعت بداماں نمونے برسات کے احوال پر مشتمل ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۰۹ - ۱۱۰

۲۔ ؍؍ ؍؍ ص ۲۵۸

ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے، کتابیں،
قلمدان سب توشہ خانہ میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے
کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کہاں بیٹھ کر؟ ۱

یہاں محل وقوع کی نشان دہی کے ساتھ بوسیدہ مکان اور ٹپکتی چھتوں اور بکھرے سامان کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی تصویر ہے جس میں ماضی اور حال کے صیغوں کے امتزاج نے اثرانگیزی کی ہے۔ اسی برسات کی بے مہری کا احوال ایک دوسرے خط میں بھی ملتا ہے جو نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ہے۔

میاں،

میں بڑی مصیبت میں ہوں، محل سرا کی دیواریں گر گئی
ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی
ہیں ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے
بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ رحمت سے گھبرا گیا
ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی
ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے؟ مینہ
کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح
رہوں ۲

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی ماضی اور حال کے افعال کے استعمال نے بیان کو وسیع تر بنا دیا ہے، اور مکتوب نگار کے جملہ معترضہ نے رجواس کی ذات سے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۰۴

۲۔ ص ۸۱

متعلق ہے) اسلوب کی لطافت کے ساتھ ساتھ) ہلکی سی دردمندی بھی پیدا کر دی ہے۔ مکتوب نگار طبقۂ اشرافیہ کی معاشرت کا پروردہ اور قدرداں ہے۔ اس کی نفاست پسندی، اور راحت طلبی اسی اعلیٰ معیار کی دین ہے۔ قیام رام پور میں حکیم نجف خاں کا خط ملتا ہے جس میں وہ غالب کے خورد و نوش کے اوقات کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں غالب شاہی مہمان داری کی جو تفصیل پیش کرتے ہیں وہ عالی مقام میزبان سے جذبۂ تحسین کے اظہار کے علاوہ جزئیات کی دل چسپ تصویر بن جاتی ہے۔

> خدا کی قسم میں یہاں بہت خوش اور تندرست ہوں، دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربّے، اچار، میں بھی خوش لڑکے بھی خوش، کلوا اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے حجام رکھ لیا ہے۔ ا

موسم اور گرد و پیش کے احوال سے متعلق یہ چھوٹا سا تراشہ بھی بیان کی اچھی مثال ہے۔

> یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقّہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۳۸۰

جی چاہا، یہ باتیں کرلیں۔[1]

موسم اور گردو پیش کی یہ تصویر کشی کبھی ماضی میں گذرے ہبئے لمحات کی کسک آمیز یاد کو حال میں لاکر بیان کا ایک نادر نمونہ بن جاتی ہے۔

صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑرہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حروف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہونچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب[2]

یہاں آتش اور روشنی کے امتزاج سے یادوں اور محسوسات کا ایک لفظی تانا بانا بنا گیا ہے۔ آخری جملے کے اتنی لہجہ نے ایک واضح صوری اور معنوی دل کشی پیدا کردی ہے۔

مرقع نگاری کا ایک بولتا ہوا نمونہ حکیم غلام نجف خاں کے نام اس خط میں ملتا ہے جو لائق توجہ ہے۔

حضرت،

غور کی جگہ ہے۔ ایک مکان دلکشا کوچہ کی سیر، بازار کا تماشہ، دو کمرے، دو کوٹھریاں، آتش دان، صحن وسیع، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے۔ دروازہ

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۹

۲۔ " " ص ۲۰۹

کرتا ہے۔ لہجہ پر غور کیجئے تو ایسا لگتا ہے کہ مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی تپش نے تمام مصائب کو پگھلا کر محسوس بنا دیا ہے۔

سید یوسف مرزا کے نام خط میں دلّی کی بربادی کا خاکہ ملتا ہے۔ جہاں نہ صرف اس کی ویرانی کا تذکرہ کیا گیا ہے بلکہ اس کی بربادی کے مشوروں کا دل دوز حربہ بھی موجود ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں دلی کے ذرہ ذرہ سے مکتوب نگار کی غیر معمولی محبت کا اظہار ہوتا ہے اور نثر کے اس شہر آشوب میں مرثیہ کی لے سنی جا سکتی ہے۔

> آغا باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ حداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم رفیع مشہور اس کے انہدام کا غم کس کو نہیں ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ، اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا پارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بہلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اتو جان کے دروازہ سے قلعہ کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارات باقی نہ رہیں گے۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے۔ کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہل شہر ہی نہ رہے بشہر کو لے کر کیا چولھے میں ڈالوں۔ ۱

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۹۹ - ۴۰۰

۱۸۵۹ء میں انگریزی سرکار دلی کے خاص علاقے میں دکانوں اور مکانوں کے انہدام اور نئی تعمیرات کے منصوبے پر غور کر رہی ہے۔ مکتوب نگار یوسف مرزا کے روبرو اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ اس نوع کے متعدد واقعات کا چند سطور میں بیان سپاٹ پن پیدا کر سکتا تھا۔ مگر غالب کے قلم نے جس انداز سے اس پر تبصرہ کیا ہے تو اس کے تہ نشیں جذبات کی محزونی کی دبی دبی لہر سر اٹھاتی ہے۔ مذہبی مراکز سے عقیدت کے علاوہ تاریخی عمارتوں سے بھی ان کی دل چسپی اور لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دلی سے شیفتگی اور سماجی شعور کے اثر آفریں اور پر زور اظہار کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

> ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے، آج اکیسواں دن ہے، آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھار اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے، کوئی دن نہیں کہ دو چار جگہ کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار ہا مکان گر گئے سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے، جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سن

لیا۔ دلّی کا حال [1]

لفظی تکرار کے سہارے خیال کو جس طرح اٹھایا گیا ہے، اس کی وجہ سے ایک دن کی مسلسل بارش میں بھیگے ہوئے شہر دلی اور خلقت کی حیرانی و سرگردانی کا پورا نقشہ روشن ہو جاتا ہے۔ خط کے آخری جملے نے اسلوب کی لطافت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ہلکی سی دردمندی کی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔

آشوبِ دلی کی ایک اور مثال علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء کے خط میں ملتی ہے۔

> اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان، اہلِ حرفہ، یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیہ روز کا پنشن دار

۱۔ خطوطِ غالب مہر ص

سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر
نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی
طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی
محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے نہ دوا نہ غذا،
انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔
احیا رکو پوچھو، ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں
میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں،
مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا
ضبط ہو جائے۔ ۱

اس خط میں ماضی اور حال کے تضاد اور الفاظ کی تکرار کی وجہ سے،
ایک خطیبانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے جو جذر کے جملوں میں گمبھیر المیٰ دھن بن
جاتا ہے۔ جذبات کی شدت کی وجہ سے لہجہ میں تلخی در آئی ہے خاص طور سے
عورتوں کے حوالے میں ـــ مگر مجموعی طور سے پوری عبارت تاثیر سے
مملو ہے۔ جو عصری حقائق کے کرب سے وجود میں آتی ہے۔

غالب بڑے شاعر ہی نہیں بڑے انسان بھی تھے۔ یوں بھی عظیم شخصیت
اور عظیم ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ وہ وسیع المشرب انس کے جویا
اور محبت کے پیامبر تھے، اگر ایک طرف دلی کی سرزمین کے اجڑنے سے ان
کے دل پر چوٹ لگی تو دوسری طرف اپنے احباب اقارب کی تباہ حالی سے بھی
ان کی طبیعت نے گہرا صدمہ قبول کیا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غدر کی دار و گیر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۷۰-۷۱

کے باوجود ان کو ہندوستانیوں اور فرنگیوں سے یکساں تعلق رہا، جو ان کی وسیع المشربی کی دلیل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے قتل عام کا جب وہ تذکرہ کرتے ہیں تو حزن و ملال کی ایک زیریں لہر ان کے پورے وجود کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ خطوط غالب میں ہم اس غم واندوہ کی جھلک دیکھتے ہیں۔ گو یہاں نالہ و فریاد کی لے اونچی نہیں ہوتی۔ تاہم حزن و یاس کا دھیما لہجہ موجود رہے جو اثر آفریں کی جان ہے۔ مرزا تفتہ کو ان الفاظ میں اپنے اس غم کا راز دار بناتے ہیں

> یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اس کا بیان تو معلوم مگر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا، کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا ہو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب جب مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [1]

زمانے کے حوادث اور مرگ دوستاں سے جو اثر ان کی طبیعت نے قبول کیا اس کے تذکرے سے بیان خود بخود درد و سوز میں ڈھلنے لگتا ہے

۱۔ خطوط غالب مہیش پرشاد ص ۲۰۸

قاضی عبدالجمیل جنون کو ان کے کلام کی اصلاح کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

فارسی کیا لکھوں ؟ یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب
یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ
غم زدہ اور آپ غم گسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ
اور خراب ہوں مرنا سر پر کھڑا ہے اور پا بہ رکاب ہوں![1]

۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ نے ذہنی اور جذباتی طور پر انھیں گہری مایوسی اور اضمحلال سے دوچار کیا تھا۔ مالی امداد کے ذرائع مسدود تھے۔ پیرانہ سالی میں عوارض کی یورش نے انداز نظر میں تبدیلی پیدا کی جس کے باعث وہ اپنے شعلۂ حیات کو مرتعش پاتے تھے۔ لیکن اس مایوسی کو انھوں نے آرزوئے مرگ میں ڈھال لیا۔ مندرجہ ذیل تراشے میں اس کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔

لیکن میری جان، انصاف تو کر، ان صلوں میں زندگی تو
بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بے ہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک۔
سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ کے۔ آس مہینے میں
اپنے آقا کے پاس جا پہونچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر،
نہ پانی کی پیاس۔ نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ
حاکم کا خوف، نہ مخبر کا خطرہ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے، نہ
کپڑا بنواؤں، نہ گوشت گھی منگواؤں، نہ روٹی پکواؤں،
عالم نور سراسر سرور۔[2]

۱۔ خطوط غالب نہر ص ۵۱۵
۲۔ " " ص ۳۹۵

ہر چند کہ یہاں گوشت، گھی اور روٹی کے معنوی اور صوتی مضمرات کچھ بے جوڑ اور سماعت پر گراں محسوس ہوتے ہیں، لیکن پوری عبارت اپنے اندر تاثر کے ایک عالم کو سموئے ہوئے ہے۔ موت کی خواہش اور حیات بعد الممات کے تصور کے ساتھ عصری سماجی حقیقت کا احساس (جس میں مخبر کا خطرہ اور کرایہ مکان کی ادائیگی کا دھڑکا بھی شامل ہے) اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ذہنی اور قلبی کیفیت کو الفاظ کے روپ میں پیش کرنے کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔ یہاں خط کے آغاز میں بے تکلفی کا لہجہ دھیرے دھیرے بلند ہوتا ہے۔

> تمھارے اشتغالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم اور قدر داں نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا، گمنام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و

راحت سے کبھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں جس سناٹے
میں ہوں۔ وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر
کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں اور جس
سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب اکو
وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے۔ سراب ہے۔ ہستی نہیں
پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی
و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل
ہوا کہ ہم تم کو ہوگا؟ ۱

اس اقتباس میں معنی کی سطح پر عالم کی بے ثباتی اور انسانی حوصلے کی آبلہ پائی
کا مرقع پیش کیا گیا۔ ہے؛ دوسری طرف مسلسل استفہامیہ جملوں کے ذریعہ
بیان میں اثر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ بوعلی سینا، نظیری، انتار اور بی، سعدی اور
حافظ کے بلند بانگ حوالوں کا سناٹے اور وہم سے تضاد اس اثر انگیزی میں
اضافہ کرتا ہے۔ دریا و سراب، ہستی اور پندار کے متضاد معنی اور پیکر اس معنوی
اثر آفرینی کو اور بھی گہرا کرتے ہیں۔ صوتی سطح پر کھڑی آوازیں (مارا، تمھارا، کہا)
اور پڑی آوازیں (حکمت، سلطنت، شاعری، ساحری، خرافات، فہم، وہم
وغیرہ) اور غنائی لے (مثلاً ن کی آوازیں) ان سب کے امتزاج سے آواز کی
لہریں ترتیب پاتی ہیں جو مفہوم کے تنوع سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ اثر آفریں آمیزش
غالب کی نثری اسلوب کا خاص امتیاز ہے۔

غالب اپنے خطوط میں جہاں عصری حوادث کا احوال رقم کرتے ہیں تو ان کے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۷۶۔۱۷۷

لہجہ میں خلوص، دردمندی اور سوز کے ملے جلے تاثر کی تھرتھراہٹ صاف طور سے محسوس ہوتی ہے۔ یوں بھی انھیں آپ بیتی اور جگ بیتی کو ملا دینے کا خاص ملکہ ہے۔ وہ غمِ دوراں کو غمِ ذات ہی کی طرح نہ صرف محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ اس کا تذکرہ بھی اس انداز سے کرتے ہیں گویا یہ بھی ذاتی دل گرفتگی اور حزن و ملال کا احوال ہے۔ سید یوسف مرزا کو ایک خط میں امراء اور اشراف کی پامالی کی داستان[۱] یوں سناتے ہیں۔

۱۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریزی فوجیں دلی پر دوبارہ قابض ہوئیں تو انھوں نے اہلِ دلی کے ساتھ جس بے رحمی کا سلوک کیا اس کی تفصیل پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون دلی سنہ ستاون میں متعدد معتبر حوالوں سے فراہم کی ہے جس سے اس دور کی دردناک تصویر سامنے آجاتی ہے۔ انگریزی فوج نے شہر میں داخل ہوتے ہی قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ لوگ نادر شاہ کی سفاکی بھول گئے (داستان غدر ظہیر دہلوی) جامع مسجد کے قریب جو لوگ کٹ کٹ کر گرتے تھے ان کی لاشوں کا ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال ہوتی ہے ...... شہر دلی کی اس خوں آشامی میں ذی حشم خاندان جان بچانے کے لئے منتشر ہوئے ...... غرض کہ جب زن و مرد شہر سے نکل گئے تو اب مخبری کا بازار گرم ہوا۔ ہزاروں مخبر چھوٹے ہوئے تھے، دو روپے آدمی مخبری کا صلہ ملتا تھا۔ دلی کا آدمی جہاں بھی گرفتار ہوا واپس دلی لایا گیا۔ کوتوالی کے سامنے تین پھانسیاں گڑی تھیں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ (دلی کالج میگزین۔ دلی ۱۹۵۳ء نمبر ۱۰۷)

اے لو، کئی دن ہو گئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھئے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپیہ پنشن کی رپورٹ گئی اور اس کی دو بہنیں سو سو روپے پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے، تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا؟ [۱]

اس عبارت میں انگریزی حکومت کے افسران کا انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کر قانون کی پامالی، اندھیر گردی اور سنگ دلی کی عبرتناک تصویر ملتی ہے۔ یوسف مرزا کے نام ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء کا طویل خط انسانی دردمندی اور جاندار قوت بیان کا مظہر ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں مکتوب نگار نے اپنے اور پرائے غم کو جس طرح سمویا ہے وہ دیدنی ہے۔ دلّی کے طبقۂ اشرافیہ کی ذلت و خواری پر نوحہ گری کے ساتھ وہ مخاطب کو اس پسماندہ طبقہ کے افراد کی بے چارگی کو بھی سامنے لاتا ہے جن کا کفیل (یعنی وہ خود) پراگندہ روزی اور پراگندہ صحت کے ہاتھوں عاجز ہو گیا ہے۔

یہاں اغنیا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور

۱۔ خطوط غالب فہرس ۲۹۸

میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے۔
اب خاص اپنا درد روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے،
تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز یہ باہر ہیں۔ مداری کے
جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے
گئے، مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم
بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمدنی نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے
کے لئے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ
بقدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت
کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔
آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر
کروں، بڑھاپا، ضعف قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا
کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ
پڑا رہتا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں، نہ کہیں جانے
کا ٹھکانہ، نہ کوئی میرے پاس آنے والا، وہ عرق جو بقدر
طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر
آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، وہ
صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں۔
نہ بے گناہ ہوں نہ گنہگار ہوں نہ مخبر نہ مفسد۔ [1]

یہ مفلسی اور بے چارگی کی دلدوز تصویر ہے۔ آدمی اور دیو، بھوت کا
تضاد، بعض جملوں میں نہیں اور نہ کی تکرار اور جملوں کی ہیئت اور جملوں کی

١۔ خطوط غالب مہر ص ٣٠٣ - ٣٠٤

ہیئت اور ساخت سے تنوع اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے، اسی خط میں ایک اور تراشہ درد سے لبریز ہے۔

میاں،

ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برہما کا بیٹا دو دن بیمار پڑا اور تیسرے دن مرگیا۔ ہے ہے کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اس کا شیوجی رام اس کے غم میں مردے سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے۔ ایک مردہ ایک دل افسردہ کون ہے جس کو تمھارا سلام کہوں؟ ؎۱

یہاں برہما کی رعایت سے لفظ بیٹا کا استعمال اور مردہ دل افسردہ کی ترکیب تاثیر میں اضافہ کی باعث ہے۔ اسی طرح "دو مصاحب" کا حوالہ اور آخر میں استفہامیہ جملے کے ذریعہ ویرانی کے احساس کو جس طرح ابھارا گیا ہے یہ اثر آفرینی کی کامیاب مثال ہے۔

خلوص اور درد کے جاندار اظہار کا دوسرا نمونہ علاءالدین احمد خاں علائی کے نام اس مختصر سے دعائیہ خط (مورخہ ۶ مئی ۱۸۶۵ء) میں بھی ملتا ہے۔

میاں،

خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین احمد خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں۔ اللہ اس کو جیتا رکھے، اُس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے۔ یارب اس کو صحت دے، یارب اس کی عمر بڑھائے۔ تین بچے، ایک اب پیدا ہونے والا ہے۔ یارب اس کو اس کی اولاد کے سر پر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۵۰۴

سلامت رکھے۔ [1]

یارب کی تکرار اور شہاب الدین احمد خاں کی بحالی صحت کے لئے تضرع میں ڈوبی ہوئی دعا کے منفرد الفاظ نے ان چند جملوں میں غیر معمولی اثر پیدا کر دیا ہے۔ علائی ہی کے نام ایک دوسرے خط میں ان کی دل جوئی اور دل داری کا انداز بھی پر زور اور لطافت آمیز ہے۔

بھائی کا غم جدا، ایسا سخن گذار، ایسا زبان آور، ایسا عیار طراریوں عاجز و درماندہ واز کار رفتہ ہو جائے، تمھارا غم جدا۔ سا غراول و درد کیا دل لے کر آئے؟ کیا زبان لے کر آئے، کیا علم لے کر آئے۔ کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہیں سکے۔ کسی شیوے کی داد نہ پائی۔ [2]

ہم معنی الفاظ کے استعمال (دراد یخی (عیار، طرار سخن ور سخن گذار) اور سبت (مثلاً غم، دل، عقل، علم) آوازوں کے امتزاج نے توقع اور ناکامیابی کی کیفیت کو صوتی مدوجزر کے ذریعہ دوبالا کیا ہے، اسی طرح "ایسا" اور "کیا" کی تکرار نے بھی بیان میں جان ڈال دی ہے۔

اس خط کے آخری جملوں میں بھی درد مندی اور سوز کی یہی کیفیت نمایاں ہے، چنانچہ مکتوب نگار علائی کو یک گونہ تسلی دیتے ہوئے رقم طراز ہے

تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہونچاؤں

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۶

۲۔ ؍ ؍ ۹۶

واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔ لیکن واللہ تمھارا حال
ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسے مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ
میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچوں کی جان و
آبرو کا نگہبان ہے۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے
قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود
دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔ [۱]

علائی کی اندرون خانہ سیاست کے ضمن میں اشارے اور کنائے میں
تبصرہ کرتے ہوئے واقعہ کربلا کا حوالہ اور نہ چاہنے کے باوجود اس سے تشبیہ
دینا دلی ہمدردی اور غایت احتیاط کی دلیل ہے، جان وآبرو کی رعایت سے
خالق اور نگہبان کے الفاظ کا استعمال اثر آفریں ہے، لیکن دوسروں کے
لئے اس قدر ہمدردی رکھنے والی ہستی کا اپنے متعلق یہ دل دوز تبصرہ کہ
"وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں
ہوں" حالات کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔ مکتوب نگار کی مالی پریشانیوں
کے احوال نے بھیک کے مفہوم میں سمٹ کر بے چارگی کی انتہا کو نمایاں کیا ہے اس
لفظ کی تکرار اثر میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

یوسف مرزا کے نام ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء کا ایک خط جس کا پہلے بھی حوالہ آچکا
ہے۔ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔
آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔
اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۷

عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم
کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت . ۱

اس اقتباس میں دلی کے اجتماعی اور انفرادی امن و عافیت کے مسکنوں کے خاتمہ بالخیر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ کتنے عزیز احباب و اقارب لقمۂ اجل بن گئے۔ اور کتنے چہیتے دوست دلی سے کنارا کر کے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ مرگ دوستاں اور فراقِ دوستاں کا جان لیوا احساس مکتوب نگار کے اعصاب پر بار ہے۔ مزید ستم یہ کہ وہ حالات کی ناسازگاری کے نتیجہ میں اسبابِ معیشت اور اس عزت و توقیر سے بھی محروم ہو گیا ہے جو اس کی زندگی کے مخصوص معیار کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ یہاں لفظ "غم" کی تکرار مکتوب نگار کے دل کی پکار محسوس ہوتی ہے۔ مرگ، فراق، رزق اور عزت کے اجتماع سے اثر اور معنویت میں مزید گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔

ذاتی احوال کے بیان میں درد و سوز کے جذبات کا اظہار قدرتی امر ہے۔ غالب کے یہاں جگ بیتی اور آپ بیتی کی ملی جلی مثالوں سے اس کے نمونے اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ عمر کے مختلف ادوار میں انسان انفرادی غم اور مسرت کی نسبت سے دنیا کا نظارہ کرتا ہے۔ ضعیفی انسانی عمر کی آخری منزل ہے۔ جہاں پہونچتے پہونچتے اس کی شخصیت بقدر ظرف ذہنی پختگی کو چھو لیتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جسمانی انحطاط اسے شکستگی کے احساس سے بھی دوچار کرتا ہے۔ مکتوب نگار نے مرزا تفتہ کے نام ایک مکتوب مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۸۶۳ء میں اپنی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۴

سا سومر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی خفیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ ۱

تقریباً ستر سٹھ سال کی عمر میں قوائے جسمانی (جن پر ہزار ہا انسان کو اعتماد ہوتا ہے) کے انحطاط اور بے چارگی کو یہاں پُر درد انداز میں پیش کیا ہے۔ میر حبیب اللہ ذکا کے نام ۲۷، جنوری ۱۸۶۸ء کے خط میں بھی اسی ذہنی کیفیت کا اظہار ہے۔

تم میری بات پوچھتے ہو، لیکن میں کیا لکھوں۔ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اس خط کا جواب لکھ دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بو پہونچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو، پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔ بھائی اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ بالکل میرا یہی حال ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اپنی مرگ کا طالب۔ غالب ۲

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۰

۲۔ ص ۶۶۱ مہر

یہ احوال زوال عمر کی سچی کیفیت سے عبارت ہے جس میں تولوں اور ماشوں کے فرق اور مہینوں کے بجائے دنوں پر منحصر زندگی کے امکان کے تذکرے سے خاص اثر پیدا ہوگیا ہے۔ مکتوب نگار ۱۴ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کے خط کے اختتام پر مرزا تفتہ کو اپنی نقاہت کی جو کیفیت بتاتا ہے اس میں گرتی ہوئی صحت سے ایک قسم کے ذہنی سمجھوتے کا احساس موجود ہے۔

میں ناتواں بہت ہوگیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔
کوئی شخص نیا تکلف کی مودت کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔
ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔ لیٹے لیٹے
مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ [1]

غالب کی زندگی کے آخری ایام کے خطوط میں موت کی آہٹ لحظہ بہ لحظہ تیز تر سنائی دیتی ہے۔ علائی کے نام ۲۱ر جون ۱۸۶۸ء کے وصیت نما خط میں یہ چند پر درد جملے ملتے ہیں۔

اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں
کیا مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس
کہتے ہیں اور جیوں۔ ورنہ دو چار مہینے، پانچ سات ہفتے،
دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ [2]

ان جملوں میں اعداد کو بتدریج گھٹاتے ہوئے تقلیل زمانی کی مدد سے انتظار مرگ پر یقین کی گہری چھاپ لگا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نفی و اثبات

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۱۹۹
۲۔ ؍ ؍ ص ۱۰۴

کا یہ تضاد جو "نہ رہی" اور "رہ گئی ہے" کے کلیدی افعال کے ذریعہ پیدا کیا گیا ہے۔ لہجہ کے درد و سوز میں اضافہ کا باعث ہے۔ اسی ضمن میں علائی کے نام دو جملے بھی مخصوص کیفیت کے حامل ہیں جو مکتوب نگار نے موت سے ایک دن قبل لکھوائے تھے اور جنھیں حالی نے یادگارِ غالب میں شامل کیا ہے۔

> میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے خطوط میں جا بجا گہرے درد و غم کا اظہار اثر آفرینی کا سبب بنا ہے۔ تاہم ان کی فطری شگفتگی بھی تحریر میں ڈھل کر خیال آرائی کے ایسے اعلیٰ نمونے فراہم کرتی ہے جو الفاظ کے در و بست کی ہنر مندی کی بدولت لطف و انبساط کا موجب ہوتے ہیں۔ مرزا تفتہ غالب کو بغرضِ اصلاح بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن قدرے تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ مکتوب نگار رقم طراز ہے۔

> سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم[1] میرا فرزند تھا۔ اور اب اس کے دونوں بچے[2] کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ بس تمھارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں

۱۔ زین العابدین خاں عارف بیگم غالب کے حقیقی بھانجے۔
۲۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔

ہے کہ مجھ کو کھانا نہیں کھانے دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے
پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک
اڑاتے ہیں میں تنگ نہیں آتا توان معنوی پوتوں سے کہ ان
میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد بہ سبیل
ڈاک میرے پاس بھیج دیجئے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا
ہوں کہ جلد ان کو تمھارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیجدوں گا۔ ا

شگفتگی اور الفاظ کے دروبست نے مل کر خیال آفرینی کا ایک اور دلکش نمونہ تیار کیا ہے۔ جس کے مخاطب پھر حسنِ اتفاق سے مرزا تفتہ ہیں۔ غالب نے غدر کے زمانے کے حالات فارسی نثر میں قلم بند کئے جس میں پندرہ ماہ (مئی ۱۸۵۷ء تا یکم جولائی ۱۸۵۸ء) کی شہری روئداد اور اپنی سرگذشت فارسی نثر میں بیان کی۔ اس کی چھپائی کا انتظام منشی شیو نرائن آرام کے مطبع مفید خلائق آگرہ میں شروع کرایا۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر نے سات جلدوں کی خصوصی آراستگی کی ذمہ داری قبول کی جنھیں مکتوب نگار ملکہ معظمہ انگلستان گورنر جنرل بہادر اور دوسرے انگریز حکام کو بھیجنا چاہتا ہے۔ کتاب کی جلدوں کی تزئین مکمل ہوگئی ہے لیکن ابھی دلی نہیں پہونچی ہے۔ اسی سیاق وسباق میں مکتوب نگار تفتہ کے خط میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو پیغام بھیجتا ہے۔

جناب مرزا حاتم کو میرا سلام کہئے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب
کا حسن کانوں سے سنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۲۷

مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی
کرر ہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق
آنکھوں کو کب تک ملے گا؟ ۱

یہاں خیال آرائی، حسنِ طلب اور اثر آفرینی باہم آمیز نظر آتی ہیں۔ ۲
خوش طبعی انسان کے دل و دماغ کی شادابی کی علامت ہے، گفتگو اور تحریر
میں شوخی اور ظرافت مزاج کی اسی لہر سے وجود میں آتی ہے۔ مزاح کا خام
مواد عموماً زندگی کی کجرویوں اور افراد سے سرزد ہونے والی چھوٹی بڑی کمزوریاں
سے حاصل ہوتا ہے لیکن غالب کی شوخیٔ تحریر کا ہدف وہ چھوٹے چھوٹے
نقطے ہیں جو دوستانہ گفتگو کے درمیان تعلقات کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۹۶

۲۔ سات جلدوں کا یہ ارمغان، جب غالب وصول کرتے ہیں تو مسرت اور حیرت
سے مغلوب ہو کر مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں۔

"سات جلدوں کا پارسل پہونچا۔ واہ کیا خوب برمحل پہونچا۔ آدمی کو موافق
اس کی تمنا کے آرزو بر آتی سب محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر
از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف
اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی دو کی لوحیں زرّیں اور پانچ
کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس
رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہاں ہے تم جہان میں رہو۔"

خطوط غالب مہر ص ۲۲۲

انانیت کا شدید احساس رکھنے کے باوجود غالب مزاج کے اعتبار سے مجلس پسند انسان تھے۔ ان کی یہ مجلس خواص، مزاج شناسوں اور قدر دانوں کے دم قدم سے آباد تھی۔ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ مکتوب نگاری اسی آرزوئے بزم آرائی کی تخیلی تکمیل تھی جس کی اصلی بساط ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں الٹ ہو گئی تھی۔ دوست داری کا پُرخلوص تقاضا ہے کہ خطوط کے ذریعہ دوستوں کو ہنسی کی سوغات بھیجی جائے۔ خط کی محدود فضا میں غالب نے ذہن کی حیرت انگیز چستی اور مزاح کی غیر معمولی حس کی مدد سے اہلِ محفل کو گاہ گاہ خندہ بلب کیا ہے۔ اس مجلسی ماحول میں ان کا مزاج کبھی لطیف چٹکیوں سے کام لیتا ہے۔ اور کبھی بلند بانگ شوخی اور بے ضرر استہزا پر تکیہ کرتا ہے۔ ایک خط میں مکتوب نگار مرزا حاتم علی بیگ مہر کے اس طرح چٹکی لیتے ہیں۔

> آپ کا خط کل پہونچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا جلد لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گذارا پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخور افزائش ہے۔

مقفّٰی عبارت کا اہتمام روایتی انداز تحریر پر ہلکی سی چوٹ ہے۔ مگر اس میں دل آنے کی چٹکی لینا اور نصیب دشمناں کے وزن پر نصیب دوستاں کی ترکیب مکتوب نگار کی فطری شوخی کی غماز ہے۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۲

اپنے عزیز شاگرد میر مہدی مجروح سے طبیعت کی ہم آہنگی کی وجہ سے غالب کی خوش طبعی کو اکثر و بیشتر کھل کھیلنے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ مجروح کے نام خطوط میں میر نصیر الدین، میر سرفراز حسین اور میر میرن صاحب (میر افضل علی) کا بار بار تذکرہ آتا ہے۔ پانی پت میں ان عقیدت مندوں کی یکجائی کی وجہ سے ہنسی مذاق اور دل لگی کا سامان بہ افراط موجود ہے۔ مزاح کی مدد سے تیار کی ہوئی حرف و حکایت کے تانے بانے میں تندرست ہنسی اور قہقہوں کی لہریں محفوظ ہیں۔ میر مہدی مجروح کو خاص انداز سے سرزنش ہوتی ہے۔

"جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف ہونے دیا، نہ ہم تخلص بہم پہونچایا۔ [1]

اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام ایک بے تکلف خط مزاحاً صیغۂ غائب میں قدیم اندازِ تخاطب کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور اس سے منسلک عیادت کے مضمون میں بھی شوخی کا عنصر نمایاں ہے۔

برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۶۸

مانع نہ آئے۔ کیا تپ ابن بن کر آئی تھی جو اسے روکتے
ہوئے شرمائے [1]

میرن صاحب کا ذکر خیر اور مکتوب الیہ کی محبوبہ کا حوالہ خط میں جان ڈال رہے
ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ عیادت میں خوش مزاجی کا رنگ مریض کی
دل بستگی میں مدد دیتا ہے۔ شوخی اور نفسیات شناسی کی یہ آمیزش مکتوب نگار
کے خلوص اور بیان کے حسن کی دلیل ہے۔

بیماری کے سلسلے میں ایک دوسرا ظریفانہ حوالہ ملاحظہ ہو۔ نواب علاء الدین
خاں علائی کو ۲ جولائی ۱۸۶۲ کو لکھتے ہیں۔

علی حسین خاں آئے۔ دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ
آسکتے ہیں نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمناں وہ لنگڑے
ہیں لولا۔ ان کے پاؤں کا احوال تم کو معلوم ہوگا۔ جونکیں لگیں
کیا ہوا؟ نوبت کہاں تک پہونچی۔ [2]

مجروح نے ایک خط میں غالب کو اپنے آشوب چشم میں مبتلا ہونے کی خبر دی
ہے۔ چشم بیمار کی اصطلاح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکتوب نگار جواب
میں مزاح کا پہلو پیدا کرتا ہے۔

میاں،
کیوں ناسپاسی اور ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار
کوئی ایسی چیز ہے جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمھارا منہ چشم بیمار

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۲
۲۔ ،، ،، ص ۸۷

کے لائق کہاں، چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے
ہیں جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو
کیا جانو؟ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر[1]
کی عادت رکھتے ہو۔ عوارضِ چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے
نورِ چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ [2]

یہاں ہم وزن الفاظ اور محاوروں کا استعمال، اور منہ کا لائق ہونا، آنکھوں کا
کا دکھنا اور عوارضِ چشم کے ساتھ نورِ چشم کی اصطلاح پیار اور مزاح کے
امتزاج کا دلچسپ نمونہ ہے۔ عیادت کا انداز اور پھر محبت آمیز فہمائش مخاطب کے
دل و دماغ کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔

گاہ گاہ طبیعت کی یہ شگفتگی شوخ جملوں سے بڑھ کر دلچسپ خیالی
تصویر یا چشمک کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی کامیاب ترین مثالیں میر مہدی
مجروح کے نام دو ڈرامائی انداز کے خطوط ہیں۔

اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم۔

حضرت آداب!

کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کو خط لکھنے کی؟ حضور
میں کیا منع کرتا ہوں؟ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست
ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے وہ
بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے
دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

۱۔ پیچش۔ ۲۔ خطوط غالب مہر ص ۱۸۹

نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہو گئے
ہیں وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔
حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔
بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز
رکھتے ہو؟
سبحان اللہ، اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے
فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔
اچھا تم باز نہیں رکھتے۔ مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ
میں میر مہدی کو خط لکھوں؟

خط میں میرن صاحب سے خیالی ملاقات اور ان کی فرمائش کہ غالب مجروح کو فوری خط نہ لکھیں ظرافت کے تانے بانے سے تیار کردہ ایک دلچسپ اختراع ہے اور آخر میں غالب ان کی خیالی فرمائش کو یوں رد کرتے ہیں۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے
کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں
آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ [1]

یہ پیرکار سادگی اور معصومیت کا یہ اظہار شوخی کی دین ہے۔

دوسرے خط میں مکتوب الیہ (میر مہدی مجروح) کو فرضی اطلاع دیتے ہیں کہ کل شام کو میرن صاحب سسرال سے روانہ ہوئے ہیں۔ رخصت کے وقت بازو پر امام ضامن کا روپیہ باندھنے کے علاوہ مٹھائی بھی ساتھ کی گئی ہے۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۴-۲۹۵

دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔
اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔
ساس عزیب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ
کر دیا ہے۔ اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا
ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری
نذر کر کے تم پر احسان دھریں گے " بھائی میں دلی سے آرہا
ہوں اور قلاقند تمھارے واسطے لارہا ہوں " زنہار نہ
باور کیجیو۔ مالِ مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ [1]

یہ معصوم افترا اور دوستوں کو پیار میں لڑا دینے کی کوشش شوخ ذہن کی اُپج ہے۔ مصنوعی خفگی اور فہمائش ظرافت کا ایک دوسرا روپ ہے۔ چنانچہ میر مہدی مجروح کی خط کا جواب نہ دینے کی شکایت پر اس طرح اپنی فرضی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔

سید صاحب،
اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ
شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں
میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز
حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات
کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن
صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشقِ زار

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۶ - ۲۹۷

نہیں ۔ بندہ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں ۔ ۱

ان چند سطور میں شوخی اور ظرافت کے ساتھ ہلکا سا طعن بھی شامل ہے جس کی زیادہ واضح مثال میر مہدی مجروح ہی کے نام ایک دوسرے خط میں ملتی ہے ۔

میرن صاحب کے خط کا جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا ۔ اب ان سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے ؟ حسن بھی کیا چیز ہے ۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے ۔ تم ان سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو ۔ میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے ؟ نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں ۔ میرے خط کا جواب ان سے لکھوا کر بھجواؤ ۔ ۲

محبت کا طعنہ اور حسن سے ڈرنے کی پھبتی نے تقاضے کو شوخی کا رنگ دیا ہے ۔

غلام حسین قدر بلگرامی اپنے ایک خط میں غالب اور ان کے بھانجے مرزا عباس کے بیٹے کے مابین رشتہ داری کا صحیح تعین کرنے سے چوک جاتے ہیں ۔ ان کی اس غلطی پر مکتوب نگار کو گرفت کا اچھا موقعہ ہاتھ آتا ہے اور وہ ظریفانہ انداز میں ان سے بازپرس کرتے ہیں ۔

صاحب ،

پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ مرزا عباس میری حقیقی

---

۱ ۔ خطوط غالب مہر ص ۳۰۲

۲ ۔ ,, ,, ص ۳۰۴

بہن کا بیٹا ہے۔ تو پھر میں مرزا کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟
مرزا کی بیوی میری بہو ہے، بیٹی نہیں۔ تم نے جو لکھا ہے میرے
نواسے کی شادی ہے۔ کیا سمجھ کے لکھا؟ میں مرزا کی اولاد
کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟ بھانجے کی اولاد پوتا پوتی ہے۔
یہ نواسا نواسی مجھ کو اس کی اولاد کا جدِ فاسد سمجھنا ٹکسال
باہر بات ہے ۱

یہ جانتے ہوئے کہ مکتوب الیہ ان کے روزانہ مشاغل سے پوری طرح
واقف ہے وہ اسے محظوظ کرنے کے لئے ماہِ رمضان کے اوقات کی فرضی
تفصیل فراہم کرتے ہیں۔

میر مہدی،

تم میری عادت بھول گئے؟ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی
مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اس مہینے میں رام پور
کیوں رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے
رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں
ایسے انداز سے چلا کر چاند رات کے دن یہاں آپہونچا۔ یکشنبہ
کو غرہ ماہ متبرک ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی
مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن
سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔
کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۵۵۳

روزہ کھولتا ہوں، اور سرد پانی پیتا ہوں ۔ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ [1]

مکتوب نگار میر مہدی کے اسلوب نگارش کی تعریف ظرافت کے پیرائے میں اس طرح کرتا ہے ۔

آفریں صد ہزار آفریں، اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ۔سنو دلی کے تمام مال و متاع زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی ۔سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا، لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسے بحل کیا۔ ۲

مندرجہ بالا عبارت ایک خاص اسلوب میں ڈھلی ہوئی ہے جو مکتوب نگار کی بلند و بالا شخصیت کی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے ۔انھی مجروح کو دوسرے خط میں یوں فہمائش کرتے ہیں۔

خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے ، بوڑھا ہونے کو آیا۔ داڑھی میں بال سفید آ گئے مگر بات سمجھنی نہ آئی ۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے ۔

چیل بسولا ئے گی تو کا ہے سے کھٹکوں راب ؟ ۳

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۰

۲۔ ص ۲۷۷

۳۔ ص ۲۷۵

یہاں ظرافت میں جھنجھلاہٹ کی زیریں لہر محسوس ہوتی ہے، کیونکہ گفتگو کا موضوع ان کی پنشن سے متعلق ہے۔ اسی طرح امیر خسرو کی امثلہ جو انسانوں کے بیڈھنگے انداز نظر کو روشن کرتی ہے۔ مکتوب الیہ پر صحیح صورت حال واضح کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مجروح کی ناواقفیت اور ان کے سوال کے بے تکے پن پر لطیف چوٹ ہے۔

مکتوب نگار خط کے اختتام پر اپنے مشترک دوستوں اور عقیدتمندوں کو دعا لکھتے ہوئے انھیں ظریفانہ خطابات سے نوازتا ہے مثلاً مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔ ان خطابات میں خفیف سا معنوی علاقہ بھی ہے۔ مجتہد، قطب اور پیغمبر (یوسف) شریعت اور طریقت کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس تنوع نے دعائیہ جملوں کو جدت اور پیار کا آہنگ دیا ہے۔ مجروح ہی کے نام میر افضل علی (میرن صاحب) کے متعلق خطاب در خطاب کا ایک دلچسپ اور نیا سلسلہ سامنے آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے پچھلے خط کے جواب میں میر مہدی مجروح نے یوسف ہند کے خطاب پر کوئی جملہ چست کیا ہے، جس پر مصنوعی خفگی کے ساتھ غالب انھیں اور بھی زیادہ شاندار خطابوں سے نوازتے ہیں۔

> ابی وہ یوسف ہند نہ سہی، یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی،
> یوسف ہفت کشور سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔
> مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپے
> مہینہ بھیجے جاؤں گا (اب اس کا تقاضہ ہے) [1]

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۸۲

یوسف کی رعایت سے زلیخا اور ان دونوں کے علاقے سے ستم کا برپا ہونا لکھنے والے کی شوخیٔ مزاج کی کھلی غمازی کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ القاب کی ترقی اور گیرائی کے مسلسل اضافے نے بھی بیان میں نئی روح پھونکی ہے۔ یہ القاب زمین و زماں دونوں جہتوں سے منسلک ہیں۔ مکان کے حدود میں ان کی رسائی ملک سے بڑھ کر ہفت کشور تک ہے اور سطح زمانی پر یہ دہر اور عمر پر بھی حاوی ہے۔ یہاں زمان و مکان کی وسعت کو الفاظ کی گرفت میں لانے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ لکھنے والے کے ذہن کی برق رفتاری کی آئینہ دار ہے۔

حسن طلب میں شوخی کا اظہار نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے نام ایک خط میں ملتا ہے جس میں ولی نعمت آیۂ رحمت کی بارگاہ سے اپنے صاحبزادے کی شادی کے موقع پر تورہ اور خلعت کے لئے رقم پا کر اظہار تشکر کے بعد عرض کرتے ہیں۔

یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کرا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سو اسو روپے جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوتے ہیں میں

۱۔ مکاتیب غالب میں امتیاز علی عرشی فٹ نوٹ میں نواب رام پور کے منجھلے بیٹے کی شادی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "(یہ شادی ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء میں ہوئی تھی)...... " ریاست کے بیرونی متوسلین اور احباب کے نام دعوت نامے جاری ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی لیکن وہ ضعف طبع کی وجہ سے نہ آسکے..... مرزا صاحب نے تورہ و خلعت کا عطیہ پا کر ایک تہنیت نامہ اور دو قطعات مبارکباد نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کئے تھے۔"

از مکاتیب غالب ص ۲۹

کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس
نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں۔ [1]

ظرافت کبھی کبھی طنز و استہزا کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔ لیکن غالب کا طنز یہ تیکھا اور تلخ نہیں ہے۔ یہ بے ضرر استہزا اور مزاح کی حدود کو پار نہیں کرتا۔ مندرجہ ذیل سطور سے جہاں مکتوب نگار کی آزاد خیالی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں زمانے کی روش پر ہلکا سا طنز بھی ملتا ہے اور مجموعی طور سے یادِ ماضی کی کسک بھی موجود ہے۔

جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی
کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ
آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور
داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک
وردی ہے عام ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ،
جولاہا، کنجڑہ، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی
رکھی، اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی
العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔ [2]

حزن و ملال اور شوخی و ظرافت کی آمیزش کا یہ نمونہ آپ اپنی مثال ہے۔

کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی،
کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر

۱۔ مکاتیب غالب۔ امتیاز علی عرشی ص ۲۹

۲۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۷

ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چناجان" نہ سہی
"مناجان سہی" میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور
سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک
حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے
ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ
کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن نہ ہو جائے گی۔ طبیعت
کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی
ایک شاخ۔ چشم بددور، وہی ایک حور، بھائی، ہوش
میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔ ۲

مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام یہ تعزیت نامہ جہاں رواقی فلسفہ کی توضیح
کرتا ہے وہیں مکتوب نگار کے تشکک اور تنوع پسندی کا بھی غماز ہے۔ ردیف
اور قافیہ کے التزام کے ساتھ جنت کے روایتی تصور پر پھبتی ہے اور اس نیا
ہے ہے کے بین نے اور بھی جان ڈال دی ہے، طوبیٰ اور زمردیں کاخ کے
تقدیس آمیز تصور اور چشم بددور کے بلند بانگ محاورے کے بعد "کہیں اور
دل لگاؤ" کا محاورہ اور اسی طرح چناجان اور مناجان کے فوراً بعد بہشت کا
تذکرہ یہ سب گویا صوتی اور معنوی لہروں کا ایک تلاطم ہے جو مکتوب نگار کے
شوخ اور بیباک ذہن کی پرواز کا پتہ دیتا ہے۔ استہزا کا یہ دلچسپ انداز
اپنی ملازمہ بی وفادار کی کردار نگاری میں بھی اجاگر ہوا ہے۔
بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۹

بیوی نے ان کو وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا
تو کیا لائیں گی، مگر خلیق و ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے
باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں
کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے
سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں
اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمھارے
چچا کے بیٹے کی کائیں کی ایں"۔ (تمھارے چچا کے بیٹے کی
کیاری کے ہیں) ہے ہے، ایسے عالی شان دیوان خانے
کی یہ قسمت! اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت!

"سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق و ملنسار ہیں" معترضہ جملوں میں ہلکا سا طنز پوشیدہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بی وفادار کے مردانہ کردار، مرگشت اور ان کی مخصوص بولی کی نقل ایک مزاح پرور اور شوخ ذہن کی پیداوار ہے۔

اسی لطیف طنز اور مزاح نے بیماری اور علاج کے بیان کو بھی شگفتہ بنا دیا ہے۔ علاءالدین خاں علائیؔ کے نام ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء کی دوپہر (ہنگامِ نیم روز) میں لکھے ہوئے ایک خط سے مندرجہ ذیل نمونہ پیش ہے۔

حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے یعنی انھوں نے
نسخہ لکھ دیا ہے۔ سوا اس کے موافق جوب بن گئے ہیں۔
نقوع کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل جوب کے اوپر وہ

۱۔ خطوطِ غالب ص ۲۰ھ

نقوع پیاجائے گا۔ مگر انداز وادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہواخواہوں کی رائے
میں قصہ اس استعلاج کا مذبذب ہے۔ نسخہ کی حقیقت
کو میزان کی نظر تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے۔
ہم معقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ ۱

علائی کے والد (نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو) دلی میں
بغرض علاج مقیم ہیں۔ مکتوب نگاران کی صحیح کیفیت سے بیٹے کو مطلع کرتا ہے
علاج کی پوری تیاری کے باوجود مریض اور ہواخواہوں کا تذبذب نظر میں
تولنے کا محاورہ اور اس کی رعایت سے میزان کی اصطلاح اس کے باغ و
بہار ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ اپنے نام کے ساتھ جو خطاب استعمال کیا
ہے اس کا مقصد مخاطب کو محظوظ کرنا ہے۔ مگر بعض اوقات طنز کی دھار
تیز تر ہو جاتی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب ان کی خودداری کو ٹھیس
پہونچی ہے تو ان کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔ علائی کی اس اطلاع
پر کہ دوجانہ میں تقریب شادی پر آپ کا انتظار رہا۔ طنزیہ لہجہ میں اس طرح
استفسار ہوتا ہے۔

دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی
پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انہی ظنوں کا، جن سے تمہارے چچا
کو گمان ہے مجھ پر جنوں کا، جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک
جاگیردار مجھ کو بلاتا، گویا نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۷۰

چلا جاتا۔[1]

بسا اوقات غالب کی شوخی اور ذکاوت انھیں بات میں پیدا کرنے اور گفتگو کو پہلو دار بنانے پر اکساتی ہے۔ چنانچہ علاء الدین احمد خاں علائیؔ کے نام خط کے اس تراشے میں خیال آفرینی اور رشتے کی نزاکتوں کا خیال ملاحظہ ہو۔

استاد میر جان کو، اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام۔ اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درود اور موافق اس مصرع کے:

سوئے اللہ واللہ، مافی الوجود

سجود،[2]

علت اور معلول کا تلازمہ اور آداب کی درجہ بندی جو دعا سے شروع ہو کر سجود پر ختم ہوتی ہے ذہن کی اپج اور مزاح کی دلیل ہے جس نے بیان کو دل کشی بخشی ہے۔ ظریفانہ توجیہ کی ایک اور مثال علائیؔ کے نام ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء کے خط میں بھی ملتی ہے۔ مکتوب نگار اپنے گناہوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے جس کی پاداش میں اسے جہنم کے سپرد کیا جائے گا۔ اپنے مذہب و مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے خود کو جہنم میں چلا جانے کی توجیہ میں جو لطف

۱۔ خطوط غالب جلد ۲ ص ۴۷

۲۔ ص ۶۶

پیدا کیا ہے سننے کے قابل ہے۔

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو مجھ کو جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا، تاکہ منکرین و مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں![1]

ذہن کی بالیدگی اور مزاج کی شوخی کا مظاہرہ ایک خط میں متعدد قسموں کی شکل میں ملتا ہے۔ علائی کا مکتوب نگار سے شدید تقاضا ہے کہ اس کا قصیدہ اور رباعیاں جلد سے جلد واپس کی جائیں، غالب اس سے قبل ان کو لکھ چکے تھے کہ یہ چیزیں ان کے پاس نہیں ہیں۔ چنانچہ مکرر تقاضے پر وہ بگڑتے ہیں تو اس انداز سے ایک نیا پیرایہ بیان تراشتے ہیں۔

مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کونسی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج۔ قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر کہئیے گا۔ بھائی، قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، زند کی قسم، پازند کی قسم، استا کی قسم، گورو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے رباعیاں یاد۔[2]

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۸۰

۲۔ ص ۸۲

انکار کے لئے دس قسموں کا پے در پے کھانا جہاں ان کی وسیع المشربی کی شہادت فراہم کرتا ہے ۔ وہیں ذہن کی تیزی کا شعلہ بھی لپکتا محسوس ہوتا ہے ۔ اور یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ ان قسموں میں سے کوئی قسم تو مکتوب الیہ کے لئے قابلِ قبول ہوگی ۔ یعنی ایک طرح سے خود اس کا مسلک بھی مبہم اور غیر واضح ہے ۔ یہ گویا علائی سے بے تکلف مذاق کا اظہار ہے ۔

نفسیاتی اعتبار سے شوخی وظرافت ذہن کے انبساط اور فکر کی آسودگی کا مظہر ہے ۔ لیکن بعض اوقات شگفتگی اور جودت تلخ حقیقتوں یا ناپسندیدہ چیزوں کے ردّ عمل سے طنز کا روپ دھار لیتی ہے ۔ اس طرح طنز اور ہجو شوخی اور ظرافت کا نیم مہذب اظہار ہے ، جس کا ہدف دوسرا انسان اور ان کے افعال اور اعمال ہوتے ہیں ۔ لیکن طنز کی اعلیٰ ترین شکل خود استہزائی ہے ۔ دوسروں پر ہنسنا یقیناً خوش طبعی کی دلیل ہے ۔ لیکن خود اپنے اوپر ہنسنے کی قوت اور صلاحیت اعلیٰ ظرف کی نشان دہی کرتی ہے ۔ غالب کے یہاں یہ خود استہزائی کیفیت نمایاں طور پر موجود ہے ۔ میر مہدی مجروح کو رازداری کے عالم میں لکھتے ہیں ۔

> مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں بہت خوش ہیں ۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ہے ۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں ۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ۔ [1]

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۶

اپنی شراب نوشی کا یہ لطیف بیان مولانا کے القاب اور علیہ الرحمہ کے فقرے کے پس منظر میں خود لکھنے والے پر ایک دل چسپ چوٹ ہے اور دل نواز استہزا کی مثال بھی۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام بھی ایک خط میں مکتوب نگار نے ازراہِ تمسخر خود کو غالب علیہ الرحمہ کے نام سے پکارا۔

اکثر و بیشتر غالب کے یہاں اپنے اوپر ہنسنے کی یہ کیفیت درد و غم کا نقاب ہے۔ وہ اب اس جذبۂ خود رحمی میں بھی ہنسنے کو رونے پر ترجیح دیتے ہیں جو ان کی فطری جرارت اور طبعی شگفتگی کی دلیل ہے۔ ان کے رئیسانہ مزاج کو ایک خزانہ درکار تھا۔ لیکن وہ جاگیر دار نہیں تھے اور آمدنی کی دوسری راہیں بھی مسدود تھیں۔ پنشن ذریعۂ معاش تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس میں بھی کئی سال تک رکاوٹ رہی۔ چنانچہ مکتوب نگار مالی مشکلات کا مستقل شکار رہے۔ جس کا تذکرہ ان کے خطوط میں جابجا ملتا ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام ۸ر نومبر ۱۸۵۹ء کا ایک خط اس استہزائیہ کسک کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔

> بھائی نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے لپیٹ کر بھیجتا ہوں، غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہونچ گئی ہے۔ آج کاغذ اور ٹکٹ منگا لوں گا۔ [1]

سامانِ تحریر کا فقدان اور ڈاک کے ٹکٹ کے نہ ہونے کی مجبوری کے پس منظر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۸۲

میں لفظ فتوح خود مکتوب نگار پر ایک طرح کی پھبتی ہے جس نے بیان میں ایک عجیب قسم کا درد بھر دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دوست نوازی اور یہ تسلی بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اپنی ناداری کی خبر دینے کے فوراً بعد مکتوب الیہ کو غمگین نہ ہونے کا مشورہ بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ کہیں سے کچھ مالی مدد بہم ہوئی ہے۔

علائیؔ کے نام ایک خط میں اپنی معاشی بدحالی کا اس طرح مذاق اڑایا ہے۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں۔ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول، نہ سود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بھوپی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کلکٹری کے۔ سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا، گزارہ مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کو شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ

کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟
کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو کس طرح
جیو گے؟ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا
نہ گذرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔
قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید،
رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا [۱]

قرض کے لین دین، سود کی ادائیگی اور اخراجات کی بہتات اور پنشن کی قلیل رقم اس تذکرے میں جہاں درد و سوز کی زیریں لہر سنی جا سکتی ہے وہاں اپنی شراب نوشی ترک کر کے برائے نام کفایت شعاری کے حوالے میں اپنی بے بسی پر تمسخر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ دوستوں کے یہ جملے "تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟" اور "نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟" میں جو نشتریت پنہاں ہے اس کا ہدف مکتوب نگار کی اپنی ذات ہے۔ وہ شراب نوشی کے سلسلے میں اپنی مجبوری کا مذاق دوستوں کی زبانی خود اڑا رہا ہے۔

ذرائع آمدنی محدود ہونے کے باعث مکتوب نگار نے اپنی پریشان حالی پر ایک دوسرے خط میں اپنے اوپر چوٹ کی ہے۔ علاء الدین خاں کو منشی نولکشور سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایک دن منشی[۲] صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار
شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے
کہا، اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۷۸۔ ۷۹

۲۔ منشی نولکشور غالب کو دو برس سے مہینہ میں چار بار اپنا خط بھیجتے ہیں جن کی قیمت نہیں لیتے لیکن یہ یاد رہے کہ غالب محصول ڈاک کی ادائیگی خود کرتے تھے یعنی بارہ آنے ٹکٹ مطبع میں پہونچا دیا کرتے تھے۔

تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں
ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار یعنی سات سو پچاس روپیے
سرکار انگریزی سے پاتا ہوں، بارہ سو روپیے رام پور سے
چوبیس روپیہ ان مہاراج سے ۔ ۱

اپنی ذات کو استہزا کا نشانہ بنانے کے لئے مکتوب نگار کے پاس نفسیاتی وجوہ ہیں جن کے اندر جھانکیے تو وہ عمر کے بڑے حصے میں کشاکش حیات (جس میں مالی احتیاجات سرفہرست ہیں) سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ خود کو تکیہ دار کہنا اور تین جگہوں کا روزینہ دار قرار دینا اپنا کھلا ہوا استہزا ہے۔ منشی نولکشور سے چوبیس روپیہ سالانہ کی آمدنی کی توضیح اس خط میں یہ کی گئی ہے کہ وہ غالب کو ہر ہفتہ اپنا اخبار بھیجتے تھے۔ اپنے متعلق یہ کہنا کہ "اگر میں دنیادار ہوتا" بھی اپنے اوپر لطیف طنز کی مثال ہے۔

مالی مشکلات کے علاوہ جائے رہائش سے متعلق بھی اکثر و بیشتر مسائل پیدا ہوتے رہتے تھے۔ جولائی ۱۸۶۲ء کے طوفان باراں نے محل سرا کی دیواریں منہدم کر دیں، چھتیں بری طرح ٹپکنے لگیں۔ اور دیوان خانہ بھی مخدوش ہو چلا تھا۔ اس ابتلا میں غالب علاءالدین خاں علائی سے فرمائش کرتے ہیں۔

اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی
جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور
کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں
مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو، برسات گذر جائے
گی، مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے
قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ ۲

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۸۹
۲۔ ص ۸۱

بے کسی اور بے چارگی کے اس منظر میں اپنے کو "صاحب" اور بیگم کو "میم" اور اپنے پوتوں کو "بابا لوگ" کہہ کر گویا مکتوب نگار نے خود اپنے اوپر پھبتی کسی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں آخری جملہ بھی نشتریت کا حامل ہے گویا یہ ساری مدد ایک عارضی انتظام کے لئے ممکن تھی۔ اور برسات بعد بیپناہ گزیں اپنے پرانے مکان میں منتقل ہوجائیں گے۔ مسکن کے ساتھ قدیم کا لفظ مکتوب نگار کی طویل سکونت کی نشاندہی کرنے کے ساتھ مکان کی بوسیدگی کو بھی روشن تر کرتا ہے۔ اس طرح یہ لفظ مکان اور مکین دونوں پر دل دوز استہزا ہے۔

گرتی ہوئی صحت نے غالب نے اپنی موت کی پیشین گوئی پر اکسایا۔ چنانچہ انھوں نے دوستوں کو خبر دی کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔ وبا پھیلی لیکن وہ ہر طرح محفوظ و مامون رہے۔ میر مہدی نے شاید اپنے خط میں ان کی درازیٔ عمر پر اظہار مسرت کرتے ہوئے موت کی غلط پیشین گوئی کا مذاق اڑایا تھا۔ غالب ۲۶ رجولائی ۱۸۶۱ء کے خط میں جو وجہ جواز نکالتے ہیں وہ یوں ہے۔

لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا۔

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں،

۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں

۱۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: غالب نے ایک قطعہ کہا تھا

من کہ باشم کہ جاوداں باشم / چوں نظیری نماند و طالب مرد

در بہ پرسند در کدامیں سال / مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اس سے ۱۲۷۷ھ نکلتے ہیں۔ چنانچہ غالب نے دوستوں کو لکھا کہ میں ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا۔ لیکن یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ خطوط غالب ص ۲۸۹

مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی
بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔ ۱

خود کو لسان الغیب (حافظ شیراز) قرار دے کر اپنے متعلق لفظ فرمانا کا استعمال فرضی عظمت سازی ہے جس کے کھوکھلے پن کا خود دیکھنے والے کو احساس ہے۔ بستان کے دعوی کے پس پردہ بے بسی کا یہ عالم ہے کہ موت تک اس سے بیزاری کا اظہار مقصود ہے۔

خود استہزائی کا سب سے جاندار نمونہ مرزا قربان علی بیگ سالک کے خط میں ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت میں غالب نے خود کو غیر تصور کر کے بے رحمی کے ساتھ اپنے دکھوں کا مذاق اڑایا ہے۔

اپنا تماشائی آپ بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہونچتا ہے۔ کہتا ہوں۔ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و "عرش نشیں" خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آیئے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ "اجی حضرت

۱۔ خطوطِ غالب مہر ص ۲۹۰

نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، او غلان صاحب!
آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟
کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی
سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش
سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا
کہاں سے دوں گا۔ [1]

اس خط میں رزمیہ اور ہجویہ آہنگ باہم پیوست نظر آتے ہیں۔ بڑا شاعر، فارسی داں، جنت آرام گاہ، عرش نشیں، شاہ قلمرو سخن، نجم الدولہ بہادر، نواب صاحب، اوغلان صاحب سلجوقی وافراسیابی وغیرہ بلند مناصب اور پُرشکوہ الفاظ اگر رفعت وتوقیر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تو اسی سانس میں جوتی لگنا، سقر مقر ہا دیہ زاویہ قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ہونا۔ بے حیا، بے غیرت اور مفت خوری کا الزام پست ترین جہت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں انسانی اقدار کے یہ دو متضاد پہلو یکجا ہو گئے ہیں اور اس آمیزش سے ایک عجیب کرب آمیز استہزا کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اوپر دیئے ہوئے اقتباس کی نفس اور غیر نفس کی اصطلاحات [2] سے توجیہ کی ہے جس کا اشارہ خود غالب کے ان جملوں سے ملتا ہے۔

اپنا تماشائی آپ بن گیا ہوں
اور میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے
یہاں مکتوب نگار کی فنی اور داخلی شخصیتوں کا جداگانہ وجود محسوس ہوتا ہے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۱۱
۲۔ نقش غالب اسلوب احمد انصاری ص ۱۲۷

اور یہ دراصل طنز ہی کے نفسیاتی عمل کا ایک روپ ہے۔ طنز کے دو لازمی جزو ہیں، یعنی طنز نگار اور طنز کے ہدف۔ اپنے اوپر آپ ہنسنے والی شخصیت ان دونوں اجزا کو خود اپنی ذات میں سموتی ہے۔ یعنی وہ خود ہی متاہد بھی ہے اور مشہود بھی، نادک بھی ہے اور ہدف بھی۔ لیکن ان متضاد حیثیتوں کو جمع کرنے کے واسطے فنی لاشخصیت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ یہ ایک دشوار اور ارفع عمل ہے۔ غالب کے یہاں اس کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔ بظاہر ان کا یہ جملہ "رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں" ماحول سے پیدا شدہ بے بسی اور پستی کا غماز ہے۔ لیکن دراصل یہ امر فنی لاشخصیت اور بلندی کا مظہر ہے جہاں رنج و مسرت اور ذلت و عزت اپنے روایتی مفہوم سے عاری ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ چیز غور طلب ہے کہ مکتوب نگار بے حس نہیں ہے بلکہ وہ رنج و ذلت میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ غالب کو کبھی انبوہ مصائب نے یہ کہنے پر اکسایا تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم

اور مشکلات کی کثرت نے شاعر کو ان کے احساس سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لیکن اس خط میں بے حس بے نیازی کی کیفیت نہیں بلکہ منفی جذبات میں مثبت اقدار کی بازیافت کا جذبہ ملتا ہے جو ایک قسم کا جمالیاتی انبساط ہے۔ پس پردہ اس مسرت کا تطہیری پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ قرضداروں کے ہاتھوں اہانت اور بے آبروئی ایک طرح کا تطہیری عمل ہے جو جھوٹی اور مستعار عشرت اور عظمت کے سراب سے نکال کر حقیقت اور بے ریائی کے ایذا رساں ماحول میں لاتا ہے اس طرح سے تماشائی کی اس رنج و ذلت میں خوشی کسی بدنصیب کی حالت پر اسفل خوشی نہیں بلکہ سراب سے حقیقت کی طرف پیش رفت ہے۔ اس ذہنی اور نفسیاتی تطہیر کا عمل طنز کے شعلۂ تیز کا مرہونِ منت ہے۔

طبیعت کی جولانی اور ذہن کی رسائی اگر ایک طرف سے شوخی، ظرافت اور تمسخر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو دوسری طرف فکر کی ندرت اور خیال کی جدت کا

روپ بھی دھار لیتی ہے۔ غالب کی شاعری کی طرح ان کے خطوط میں بھی یہ حقیقت محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کی ندرت پسندی کا تذکرہ طرزِ تخاطب اور القاب کے سلسلے میں اوپر آ چکا ہے۔ بوجھل اور بے جان روایت سے گریز ان کے اسلوب کا یوں بھی جانا پہچانا وصف تھا۔ خط کی یاد دہانی اور جواب کی فرمائش کا یہ انداز بھی اسی خوبی کا حامل ہے۔ چنانچہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں یہ جملے لائق توجہ ہیں۔

سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے خط جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا تھا آپ کی نظر سے گذر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجئے گا اور خط کے لکھنے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا کیجئے گا۔ ۱

خط اور سلام کا تعلق، لفظ احسان کی تکرار اور اس کے دو بالا کئے جانے کی خواہش میں خیال کی ندرت عیاں ہے اور یہاں چند جملوں میں اظہارِ خلوص کے ساتھ ساتھ آخری جملے میں شعریت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس ضمن میں غالب کے معذرت نامے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ فرمائشوں کی تعمیل نہ کرنے پر جس طرح وہ منطقی استدلال سے کام لیتے ہیں یا ضعف جسمانی کی مجبوری کو آڑ بناتے ہیں وہ ان کی ذہن کی برق رفتاری اور ندرت پسندی کی دلیل ہے۔ علاء الدین خاں علائی نے اپنے بیٹے کی ولادت کی تاریخ کی فرمائش کی تھی۔ غالب اپنے جواب میں جہاں اس وہم کو دامن گیر پاتے ہیں کہ ان کی تعریف ممدوح کو راس نہیں آتی۔ وہیں پیار بھرے انداز میں علاء الدین خاں علائی کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ خود تاریخ کہیں، اس سلسلے میں شیر اور اس کے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۱۰

بچوں کی مثال برمحل ہے بلکہ ندرت پسند ذہن کی آئینہ داری کرتی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صیدافگنی
سکھاتا ہے۔ جب وہ نوجوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار
کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے ہو۔ حسنِ طبع خداداد رکھتے
ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی
کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ ۱

علاء الدین خاں علائی کے نام ایک دوسرے خط میں لوہارو نہ جانے پر معذرت پیش کی ہے۔

ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کپڑوں کے
صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں، آٹھ
کہار ٹھیکے کے لوں، چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں
چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں، رام پور سے جو
لفافہ آیا کرے گا۔ لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے
گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے۔ کہار بہم
پہونچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں ۲

تفصیلات اور جزئیات نگاری سے قطع نظر کپڑوں میں شراب چھپانے کی ترکیب اور سفر کے کثیر مصارف کا حوالہ اظہار واقعی کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار کی ذہنی بالیدگی کے شاہد ہیں اور اس ذہنی توانائی کا طاقت جسمانی کے فقدان سے تضاد بیان میں ندرت کا سبب بن گیا ہے۔

والی رام پور کے نام ایک خط میں غالب رام پور آنے کے اظہار اشتیاق

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۸۵

۲۔ ص ۶۵

کے ساتھ بڑھتے ہوئے ضعف اور بیماری کی بے بسی کی روئداد سناتے ہیں۔ شوق اور معذرت کے اس امتزاج نے ندرتِ بیان پیدا کی ہے۔

> بعد تسلیم معروض ہے نمائش گاہِ سراسر سود رام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ اتنا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے بال و پر نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریق فرضِ محال ہے ورنہ ان امور کی کہاں مجال ہے۔[۱]

ضعفِ جسمانی کی اس تصویر کے ساتھ قفس اور طائر کی تشبیہ شاعرانہ مبالغہ کے علاوہ ندرتِ خیال کا نمونہ ہے۔

شوخی کی یہ لے تہنیت کے موقعوں پر فطری طور سے اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ علائیؔ نے، اپنے بیٹے کی ولادت کی اطلاع دیتے ہوئے وضاحت نہیں کی تھی کہ نومولود بیٹا ہے یا بیٹی۔ غالب تہنیت پیش کرتے ہوئے بچے کی جنس کے متعلق اس طرح استفسار کرتے ہیں۔

> نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمھاری

۱۔ مکاتیب غالب۔ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی ص ۹۲

طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ،
ثاقب ہے کو عزیز اور غالب اس کو عزیزہ جانتا ہے واضح
لکھو تا کہ احتمال رفع ہو۔ ۱

عیادت ایک اخلاقی فریضہ ہے، اور دعائے صحت، تسلی اور تشفی عموماً عیادت ناموں کا لازمی جزو ہے۔ غالب کے خطوط میں عیادت اور تسلی اکثر مفصل اور مدلل انداز میں ملتی ہے۔ جس سے ان کی دوست نوازی کے علاوہ ذہن کی چستی اور خیالات کی روانی کا اظہار ہوتا ہے۔ علائی کو ان کے والد کی علالت کے سلسلے میں ایک مفصل خط لکھا ہے جس سے غالب کی وسیع طبی معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مکتوب نگار مرض کی کیفیت اور مریض کی جبلت کا تذکرہ کرنے کے بعد اس طرح تسلی اور مشورہ دیتا ہے۔

اب سنِ کہولت، استعمال افیون مزید علیہ، دورہ جلد جلد متواتر ہوا۔ اضطراب ازراہِ محبت ہے، ازروئے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ نظری میں یکتا حکیم امام الدین خاں، وہ ٹونک۔ عمل میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں، وہ کرولی۔ رہے حکیم محمود خاں، وہ ہمسایۂ دیوار۔ حکیم غلام نجف خاں وہ دوست قدیمِ صادق الولا۔ حکیم بقا کے خاندان میں دو صاحب موجود۔ تیسرے حکیم منجھلے وہ بھی شریک ہو جائیں گے؟ اب آپ فرمایئے حکیم کون ہے؟ ہاں، وا ایک ڈاکٹر باعتبار ہم قومی حکام نامور یا کوئی ایک آدھ بید سومنز دی اور گمنام۔ بہرحال

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۶

خاطر جمع رکھو۔ خدا کے فضل پر نظر رکھو۔ سبحان اللہ تم مجھ سے
سپارش کرو۔ امین الدین خاں کی، کیا میرے پہلو میں دل نہیں
یا میرے دل میں ایمان جس کو محبت بھی کہتے ہیں بقدر ریشہ
و سرمو کبھی نہیں، معالجہ حکما کی راہ پر رہے گا۔ ندیم اور غم خوار ی
میں اگر قصور کروں تو گنہ گار۔ ۱

مندرجہ بالا خط میں دیدہ وری کے ساتھ جس خلوص کا اظہار ملتا ہے اس کے باعث اردو کے عیادت ناموں میں یہ ایک یادگار مثال ہے۔ غالب کے عیادت ناموں میں خلوص اور ہمدردی کے علاوہ شوخی اور جدت طرازی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ علائی کے نام بعض خطوط میں ان کی یہ مزاح پسندی اور شوخی نسبتاً زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ اپنے والد کی بیماری کی طرف سے متفکر اور پریشان علائی کو مکتوب نگار مزاحیہ انداز میں تسلی دیتا ہے۔

برخوردار علی حسین خاں آیا۔ مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اس کی
زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ الولد سر لابیہ، تم اس
کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگرچہ تمھارا خانہ زاد موروثی
ہے۔ لیکن آج تک تمھاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ اب
کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھیرنے نہ دو۔ ہانک دو خبردار
اس کو اپنے پاس رہنے دینا۔ ۲

میر مہدی کو مخاطب کرتے ہوئے غالب کا قلم اکثر و بیشتر شوخی اور بے تکلفی کی

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۶۸
۲۔ ؍؍ ص ۸۸

طرف مائل نظر آتا ہے۔ اس اطلاع پر کہ آج کل مکتوب الیہٗ آشوب چشم میں مبتلا ہے وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمھارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟ اب حقیقت حال مفصل لکھو۔ ۱

عیادت کا یہ ہلکا پھلکا انداز۔ بیان کی بے تکلفی اور چشم نرگس کا حوالہ جدت پسندی کی دلیل ہے۔ یوں بھی اگر عیادت میں شگفتگی شامل ہو تو نفسیاتی طور سے یہ زیادہ تسلی بخش اور افادیت کی حامل بنتی ہے۔ اس سے اگلے خط میں اسی آشوب چشم کا حوالہ اور دعائے صحت اس طرح پیش ہے۔

تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اڑی اس کو آپ نے ازراہِ محبت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہرحال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ ۲

غبار اور گرد کی رعایت، آنکھوں میں جگہ دینے کا محاورہ اور اجڑتی ہوئی دلی کا تحت اللفظ بین ان تینوں نے مل کر اس مختصر سی عبارت کو حسن توجیہ اور جذبے کی صداقت کی مدد سے نکھار دیا ہے۔ ایک دوسرے خط میں مکتوب الیہ کے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۸۹

۲۔ ص ۲۹۰

کے بخار میں مبتلا ہو جانے پر اس کی جس طرح پرسش احوال کی ہے وہ شوخی اور ندرت کا اچھا نمونہ ہے۔

> بھائی تم نے بخار کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا
> بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آئے۔
> کیا تپ ابن بن کر آئی تھی جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔ ۱

سوالات میں جو لطیف تجاہل عارفانہ پوشیدہ ہے اس سے نہ صرف غالب کے مزاج کی شوخی کا پتہ چلتا ہے بلکہ خود مکتوب الیہ کی وضعداری اور دوست نوازی کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔

غالب کی جدّت پسندی اور شوخی صرف آسودہ لمحات کی دین نہ تھی بلکہ زندگی کے حزنیہ موقعوں پر بھی وہ اس سے دست کش نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کا اندازِ تعزیت بھی منفردِ مزاج اور خیال آفرینی سے خالی نہیں ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کی محبوبہ کے انتقال پر اظہار ملال کا یہ انداز دیدنی ہے۔

> آپ کا غم افزا نامہ پہونچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز
> کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ
> کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت۔
> سخت ملال ہوا، اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب، شعرا میں فردوسی
> اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین
> فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی
> ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق

---

۱ - خطوط غالب مہر ص ۳۰۲

کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے
مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے
بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے
گھر میں مری۔ ۱

یہاں ملال کے آہنگ کو اٹھا کر بتدریج تسلی کے لب و لہجہ میں جس طرح بدلا ہے یہ اسلوب اور نفسیات شناسی کا کمال ہے۔ پہلے مرحومہ کی اطاعت گذاری اور مکتوب الیہ سے اس کے تعلقات کا تذکرہ ہے۔ گویا مکتوب نگار کے جذبے کی آنچ کو ابھار کر تطہیر مقصود ہے۔ پھر استدلالی انداز اختیار کرتے ہوئے تین معروضات پیش کیے گئے ہیں۔ کمالِ شاعری، کمالِ فقر اور کمالِ عشق اور آخر میں خیال آفرینی کے سہارے مکتوب الیہ کو کمال عشق کی علامت یعنی مجنوں پر بھی فوقیت دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں تینوں فنون کا تذکرہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ گویا شعر، فقر اور عشق میں بنیادی عنصر جذبے اور الہامی کیفیت کا عنصر ہے جس کا رشتہ اس آفاقی تصور سے مل جاتا ہے کہ شاعری اور عشق ایک طرح کے پاکیزہ جنون ہیں۔ اسی خط میں اپنی "ستم پیشہ" محبوبہ کو یاد کر کے غالب کا ذاتی غم بھی تازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ مشترک "زخم مرگ دوست" ان کو ایک نئے رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ خط کے آخری جملے مخلصانہ تسلی اور مشورے پر مبنی ہیں۔

جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب
ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی — عشق محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس، ماسویٰ ہوس۔ ۲

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۸
۲۔ ص ۲۲۹

یہ رسمی تسلی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے آہنگ میں خلوص اور ذاتی تجزیے کا نچوڑ موجود ہے۔

یوسف مرزا کے نام دو تعزیتی خطوط میں مکتوب نگار نے ان کے خاندان کے دو افراد کی اموات پر دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ پہلا تعزیت نامہ ۱۸۵۹ء میں مکتوب الیہ کے کمسن بچے کی موت پر بھیجا گیا تھا جس میں تلقین صبر کا لب و لہجہ دھیما اور سرپرستانہ ہے۔ مکتوب الیہ کو درازئ عمر کے ساتھ نعم البدل کی بھی دعا دی گئی ہے۔

اے میری جان، اے میری آنکھیں،

زہجراں طفلے کہ در د خاک رفت

چہ نالی! کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خالق کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو، ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تمھیں جیتا رکھے، اولاد بہت۔ ۱

۱۸۶۰ء میں مکتوب نگار یوسف مرزا کو ان کی والدہ کی موت پر دوسرا تعزیت نامہ بھیجتے ہیں۔

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یونہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۹۶

ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے
ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں
نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا
مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسے کہتے
ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ ۱

ان دو خطوط کے نفس مضمون جذبات کی دو سطحوں کو سامنے لاتے ہیں۔ پہلے خط میں بزرگانہ مصلحت اندیشی کے تحت بچے کی موت پر دھیمے لہجہ میں تسلی و تشفی کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرے خط میں خاندان کے سربراہ کا ماتم مقصود ہے جو مخاطب کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اس وقت بچے کی موت کا صدمہ تازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی فریادی لَے یوسف مرزا کی بے سروپائی کے غم میں پر شور ہو گئی ہے۔

تعزیت ناموں کے ضمن میں اس مشہور خط کا حوالہ ضروری ہے جو غالب نے ۱۸۵۲ء میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا۔

بھائی صاحب، میں بھی تمھارا ہمدرد ہو گیا، یعنی منگل کے دن
۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے
آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی
آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین
پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور
ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ
یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۴۰۹

یہ نو آدمی مر گئے۔ یکبار مر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [۱]

اس وقت مکتوب نگار کی عمر لگ بھگ چھپن سال کی ہے۔ لیکن بہر بچی کا وجود اس کے لئے زندگی بھر خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہاں ماتا کے رشتے کی ناقابل بیان حلاوت اور خوبصورتی ابھرتی ہے، اور مکتوب نگار کی حیات گزراں کے نفسیاتی احوال کی طرف خفیف سا اشارہ کرتی ہے۔

"اس کے مرنے سے میں نے یہ جانا کہ یہ نو آدمی آج یکبار مر گئے"

غالب نے مکتوب نگاری میں مجلسی رنگ پیدا کرنے کے لئے جو ذرائع استعمال کئے ہیں ان میں سے بیشتر کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔ خطوط میں بے تکلف گفتگو کا تاثر ابھارنے کے لئے برمحل اشعار کا استعمال کارگر ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو خطوط میں فارسی اور اردو کے برجستہ مصرعے اور اشعار استعمال کئے ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اردو کے بیشتر اشعار جو انھوں نے خطوط میں رقم کئے ہیں ان کے اپنے ہیں۔ جب کہ فارسی اشعار خاصی تعداد میں دوسرے اساتذۂ فن کے پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے بالواسطہ طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالب اپنی اردو شاعری کو فارسی کلام کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے اردو شعرا کے کلام کے مقابلے میں انھیں اپنی اردو شاعری بلند تر محسوس ہوتی تھی۔ جس زمانے میں غالب نے یہ خط تحریر کئے ہیں دلی کا تہذیبی اور ثقافتی آب و رنگ دھندلا گیا تھا۔ انگریزی حکومت کی عملداری میں بہت سے دوست و احباب یا تو معدوم ہو چکے تھے یا مفقود الخبر۔ معاشی سرگردانی، ضعیفی اور امراض کی یورش نے مکتوب نگار کو ذہنی طور پر پژمردگی میں

۱۔ نادراتِ غالب مرتبہ آفاق حسین آفاقی ص ۴۹ - ۵۰

مبتلا کر دیا تھا۔ چنانچہ غالب نے اپنے خطوط میں جو اشعار لکھے ہیں وہ ان کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

خط کا نفس مضمون لکھنے والے کی تلخئ حالات سے پیدا شدہ کبیدگی اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے، جس کی بدولت وہ بے نیازی اور نسیان کے اس عالم میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں نہ اسے اپنے وجود کا احساس ہے اور نہ اپنی سخن سنجی کا۔

میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟ [۱]

خط میں مرقوم یہ اشعار نہ صرف حسب حال ہیں بلکہ عبارت کے سیاق و سباق

۱۔ خطوط غالب مہیش پرشاد ص ۴۷

میں گفتگو کا انداز پیدا کرنے میں بھی معاون ہیں اور اثر آفرینی کے موجب بھی۔

۸ر فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب میر مہدی مجروح کو ان کی والدہ کے انتقال پر تعزیت پیش کرتے ہوئے اپنے بھائی "مرزا یوسف دیوانہ" کی مرگِ ناگہانی کو یاد کرتے ہیں ساتھ ہی مالی پریشانیوں اور آشوبِ روزگار کا ذکر اس طرح چھیڑتا ہے۔

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو یہ کہانی کہی جائے گی۔ [۱]

نثر کے دو جملوں کے درمیان یہ برمحل شعر زندگی کی المناکیوں کو پیش کرتا ہے اور اس نے خط میں اثر کی لہر دوڑا دی ہے۔

ایک دوسرے خط میں دلی کی بربادی اور اپنے معزز دوستوں کی بے آبروئی کا تذکرہ کرتے ہوئے مکتوب نگار مجروح کو یہ برجستہ شعر سناتا ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھینا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ

۱۔ خطوطِ غالب غلام رسول مہر ص ۲۹۶

غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ۱

ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں ویرانی اور افسردگی کی جو فضا مجسم ہوئی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ دیکھ جاؤ چلے جاؤ کے الفاظ کے درمیان آرزوئے دید اور حسرتِ دید جھلکتی ہے اور ان چند جملوں سے پہلے آنے والا شعر حسرت و یاس کا ایک مرقع مخاطب کی نگاہوں کے سامنے بڑھا دیتا ہے۔ مکتوب نگار مجروح ہی کو ایک دوسرے خط میں دلی کی بربادی کی روئداد بیان کرتے ہوئے خط کے درمیان مندرجہ ذیل شعر لکھتا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے ۲

غالب نے زندگی کی بے رونقی، کثرتِ آلام اور اپنی بے نوائی کا مرثیہ مرزا حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں پیش کیا ہے اور اس رعایت سے یہ دو اشعار خط کے پیش لفظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے ۳

غم دوراں کے احوال کے علاوہ مکتوب نگار نے اپنے ضعف و ناتوانی کے بیان

۱۔ خطوطِ غالب مہر ص ۲۸۵
۲۔ ص ۲۹۸
۳۔ ص ۲۱۰

کو برمحل اشعار کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے۔ غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں وہ تخلیق اور تصنیف سے دست کشی کو اپنی پیرانہ سالی اور حالتِ زار سے منسوب کرتا ہے۔

اب جسم وجاں میں تاب وتواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اردو سواسں میں عبارت آرائی متروک جو زبان سے آوے وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر۔ کیا لکھوں اور کیا کہوں؟ یہ شعر اپنا پڑھتا ہوں۔

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا ۱

اپنے قدردان شیخ لطیف احمد بلگرامی کو اپنی صحت کی مکمل پسپائی کی اطلاع دینے کے بعد عجیب درد بھرے لہجہ میں احوال واقعی سے با خبر کیا جاتا ہے۔

فخر ابجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے۔ غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسی سال کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ سُست اب کم بخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں۔

۱۔ خطوطِ غالب ج ۱، ص ۲۴۳

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

غالب نے اپنے خطوط میں اشعار کا استعمال حزن و اضمحلال کے جذبات کے اظہار کے علاوہ مزاحاً بھی کیا ہے۔ جس میں خط کے اسلوب میں شگفتگی اور شوخی عود کر آئی ہے۔ مثلاً میر مہدی کے نام ۱۷ر جنوری ۱۸۶۵ء کے ایک خط سے یہ چند جملے دیکھیے۔

قرۃ العینین میر مہدی تو سرفراز حسین مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو میں خط نہیں لکھتا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا۔ میں جس کا جواب لکھتا۔ ۲

یہاں برجستہ شعر اور لفظ ماجرا کی تکرار نے عبارت کو شگفتگی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اسی طرح علاء الدین احمد خاں علائی سے خط نہ بھیجنے کا شکوہ کرتے ہوئے انھیں دلی بلاتے ہیں اور خط اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو ۳

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۰
۲۔ ص ۳۱۱
۳۔ ص ۵۶

اسی طرح مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں شعر کے برمحل استعمال سے شوخیٔ بیان پیدا ہوئی ہے۔

پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخور افزائش ہے۔ بقول غالب علیہ الرحمۃ

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو [۱]

شہاب الدین احمد خاں کے نام ایک مکمل خط رباعی کی شکل میں ہے جس میں مکتوب نگار مخاطب سے خط نہ بھیجنے کا شکوہ اس طرح کرتا ہے۔

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب یہ حرکت کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بیوجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے [۲]

نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیانِ رام پور کے نام بیشتر خطوط اس دعائیہ شعر پر ختم ہوئے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۲۲
۲۔ " " ص ۱۰۸

چند خطوط میں خفیف سے تصرف کے بعد یہ شعر اس طرح استعمال کیا گیا ہے ۔

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں

یہ اشعار غالب کے ان کاروباری خطوط کے ماحول سے ہم آہنگ ہیں جس میں انھوں نے احتیاجات سے مجبور ہو کر رئیس کے سامنے دست سوال دراز کیا ہے ۔

نثر کے اسلوب کی موزونیت اور ہمواری کا انحصار بڑی حد تک جملوں کی ساخت اور نشست الفاظ پر ہوتا ہے ۔ غالب کے خطوط بے تکلفی اور بے ساختگی سے عبارت ہیں ۔ جملوں کے اندر الفاظ کا موزوں دروبست، تسلسل، روانی، اور مفہوم کی بے عیب ادائیگی کے ساتھ گفتگو کا لطف بھی دوبالا کرتا ہے ۔ یہ خصوصیت مختلف ذرائع سے ظہور پذیر ہوئی ہے ۔ جس میں جملوں کی طوالت میں کمی بیشی کا التزام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔ چنانچہ بیشتر خطوط میں طویل اور مختصر جملوں کی ترتیب و تنظیم مکالمہ اور خطاب کا آہنگ پیش کرتی ہے ۔ مثال کے طور پر مرزا تفتہ کے نام خط سے یہ بظاہر اہم اقتباس ملاحظہ ہو ۔

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں ۔ پہونچا ہوگا ۔ کل ایک خط میرے پاس آیا ۔ کوئی صاحب عطاء اللہ خاں ہیں اور نامی تخلص کرتے ہیں ۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں ۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا ۔ میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا ۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں ۔ پڑھ کر معلوم کروگے ۔ ۲

---

۱ ۔ خطوط غالب مہر ص ۱۲۲

اس عبارت کے جملوں میں الفاظ کی تعداد غیر مساوی ہے۔ یہ سب مفرد جملے ہیں جن کا تسلسل غیر دلچسپ یکسانیت کا موجب ہو سکتا تھا۔ لیکن طوالت اور اختصار کی لہروں نے بیان میں سپاٹ پن پیدا نہیں ہونے دیا۔ چھوٹے اور بڑے جملوں میں پیدا شدہ نثری اسلوب کا ایک اچھا نمونہ میر مہدی مجروح کے نام ۲ فروری ۱۸۵۹ء کے اس خط میں بھی ملتا ہے جس میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رہائی کی اطلاع دی گئی ہے۔ خط یوں شروع ہوتا ہے۔

سید صاحب،

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار تم مجبور میں لاچار لو اب کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنسن کے بارے میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھیرتے ہیں۔ میں باوجود استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک پر اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر ہفتہ کو گیا۔ منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے تواں دن ہے۔ [1]

اس اقتباس میں مختصر ترین جملے دو لفظی ہیں اور سب سے طویل جملہ سترہ الفاظ

۱۔ خطوط غالب، ص ۲۷۲-۲۷۳

پر مشتمل ہے۔ شروع کے چار مختصر جملے ہیں جن میں گفتگو کے انداز کی وجہ سے فعل حذف کر دیا گیا ہے۔ مگر لفظوں کی تعداد کے لحاظ سے جملے مسلسل نہیں ہیں بلکہ نصف اول میں تین لفظوں سے شروع ہو کر سترہ لفظوں میں جملہ مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر جملے چھوٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس صراحت کا مدعا یہ نہیں ہے کہ غالب نے الفاظ گن گن کر جملوں کی در و بست کی ہے۔ بلکہ مقصد فن کار کی غیر شعوری تنوع پسندی اور سامعی حس کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اچھے فن پاروں میں غیر ارادی طور سے در آتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور اقتباس میر مہدی کے خط سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

> یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں ایک آدمی ساتھ۔ اس کے سر پر ٹوکرا۔ اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا اہاہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں لطف عام ہے۔ شراب نہیں آم ہے۔ [1]

اس ٹکڑے میں چھوٹے بڑے جملوں کے میل نے ایک دل چسپ بیانیہ کیفیت

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۰۹

پیدا کی ہے۔ نحوی تقسیم کے لحاظ سے یہاں پر بھی مفرد اور مرکب جملوں کا ملا جلا استعمال ہے۔ پہلا جملہ مرکب ہے جس کے ذیلی جملے ہم رتبہ اور وصلی ہیں۔ اگلے سات جملے مفرد ہیں۔ جن کے بعد پھر ایک جملہ (میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمانِ علم و یقین ......) مرکب ہے۔ اس کے بعد چند مفرد جملے آئے ہیں اور پھر میں نے کہا سے شروع ہوتا ہوا مرکب جملہ جس کے تابع (ابابا ہا وغیرہ) ذیلی جملہ اسمی ہے۔ پھر دوسرا ذیلی جملہ (بارے معلوم ہوا کہ)۔ دوسرے ذیلی جملے علی الترتیب ذیلی اور اسمی نوعیت کے ہیں۔ آخری پانچ جملے (یہ کچھ اور ہے۔ بشراب نہیں آم ہیں) استدراکی ہیں۔ جملوں کی صوری اور معنوی ساخت کا یہ تنوع بھی عبارت میں کلام کا زیر و بم پیدا کرتا ہے۔ مزید براں جملوں کے اختتامی الفاظ کے فرق نے بھی گفتگو کا آہنگ پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔ بیانیہ عبارت میں بالعموم اختتامی افعال یکساں ہوتے ہیں جس سے سپاٹ پن اور بے لطفی کی کیفیت پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ مگر غالب کی تحریر اس عیب سے مبرا ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں جملوں کے آخری الفاظ آ گئے۔ رہ گیا، بند کیا، آ بیٹھا، ہوئی، ہوا، بیٹھے ہیں، لیٹا ہوا ہوں، آیا، بھیجی ہوئی، کہا، بھیجی ہے، اس تنوع کی وجہ سے بیان میں زیر و بم پیدا ہو گیا ہے۔ جملوں کی ساخت اور نوعیت کے سلسلے میں ایک دوسرے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> تنخواہ کی سنو، تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے
> سود در خرچ کے جو یائے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو
> متفرقات میں اٹھ گئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں
> اس کا قرضدار ہوں۔ روپیے اس نے اپنے گھر میں رکھے

اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا۔ سود مول سات
کم پندرہ سو روپیے ہوئے۔ میں نے کہا میرے قرض متفرق
کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپیے نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں
یہ گیارہ سو روپیے بانٹ دے۔ نو سو نیچے۔ آدھے تو لے، آدھے
مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھے دو۔ ہاں سات سو
تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے
سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں
پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔
دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک
جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت
اسد اللٰہی ہے۔ ان بیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللٰہی ہے
حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں
حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے۔ ۱

یہاں پہلے جملے میں توجہ کو مرکوز کرنے والے ندائیہ انداز کے علاوہ جملوں کی
طوالت کا تنوع بیان کی تاثرانگیزی کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں کہیں کہیں
متوازی جملوں کا التزام اس پر مستزاد ہے۔ نحوی اعتبار سے کچھ جملے مرکب
ہیں اور کچھ مفرد۔ مرکب جملوں کے ذیلی جملے ہم رتبہ اور تابع دونوں قسم کے
ہیں۔ ذیلی جملے بھی متفرق ہیں۔ کوئی وصفی ہے (مثلاً جو پائے تھے وہ کٹ گئے)
تو کوئی سببی (چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں) اسمی جملے بھی موجود ہیں (جیسے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۸۹

مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے ؛ میں نے کہا میرے قرض متفرق کا حساب کر،
یا میں کہتا ہوں کہ یہ گیارہ سو بانٹ دے ۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ پندرہ سو مجھ کو دو)
کچھ جملے استدراکی ہیں (جیسے تب کچھ ہاتھ آئے گا ، میں نے آنکھ سے دیکھا
تو آنکھیں پھوٹیں) ایک تمیزی تابع جملہ بھی ہے (جب تک جیوں گا ایسا ہی
رہوں گا) کئی مفرد مختصر جملے یکجا کر دیئے گئے ہیں (جیسے بات رہ گئی ، پت رہ گئی ،
حاسدوں کو موت آگئی ، دوست شاد ہو گئے) جن سے کلام میں روانی
پیدا ہو گئی ہے ۔

جملوں کے اختتامی الفاظ میں صوتی تنوع کی ایک اور مثال پیش ہے

اے لکھنؤ ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری ،
اموال کیا ہوئے ؟ اشخاص کہاں گئے ۔ خاندان شجاع الدولہ
کے زن و مرد کا کیا ہوا ؛ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگذشت
کیا ہے ۔ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ
آگہی ہو گی ۔ اُمیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے مجھ پر مجہول نہ
رہے ۔ پتہ مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ نہیں
معلوم ہوا ۔ ظاہرا اسی قدر کافی ہو گا ۔ ورنہ آپ زیادہ
لکھتے ۔ [1]

کھلتے ، گذری ، ہوئے ، گئے ، ہوا ، ہے ، ہوں ، ہو گی ، رہے ، ہوا ، ہو گا ، لکھتے ،
یہ جملوں کے آخری الفاظ ہیں ۔ حالاں کہ ان میں سے بیشتر ایک ہی مصدر (ہونا)
سے مشتق ہیں ۔ لیکن موقعہ کی مناسبت سے ان کے استعمال میں آوازیں اور انداز

---

۱ ۔ خطوط غالب ص ۹۰

جدا جدا ہیں۔ مفرد اور مرکب جملوں کی آمیزش اور استفہامیہ طرز نمایاں ہے۔ مرکب جملے بیشتر اسمی ہیں (کچھ نہیں کھلتا کہ، گمان کرتا ہوں کہ، امید وار ہوں کہ،) اسی طرح (جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے، تابع وصلی جملہ ہے اور عبارت کا آخری جملہ سببی ہے۔

غالب کو دو لفظی مختصر جملے یکجا کر کے انھیں طویل تر جملوں سے ملاکر عبارت کا تانا بانا بننے میں کمال حاصل ہے جس کی ایک اور مثال منشی شیو نرائن آرام کے نام خط سے دی جا سکتی ہے۔

تصویر پہونچی، تحریر پہونچی، سنو میری عمر ستر برس کی ہے۔ اور تمھارا دادا میرا ہم عمر اور ہم باز تھا۔ اور میں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم سے سنا کہ تمھارے پر دادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ سو سوا سو برس کی ہماری تمھاری ملاقات ہے۔ پھر آپس میں نامہ و پیام کی رسم نہیں اور اس راہ و رسم کے مسدود ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو بسبیل ڈاک کبھی اکبر آباد نہ بلاتے۔ [1]

یہاں جملوں کے ادلتے بدلتے طول و اختصار کے علاوہ اختتامی الفاظ کا تنوع بھی لائق توجہ ہے۔ مثلاً ہے، تھا، تھے، ہوں، ہے، ہیں، ان مختلف لفظوں

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۵۸۔ ۲۵۹

سے صوتی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو بیان کو سپاٹ پن سے محفوظ رکھتی ہیں۔
بیشتر جملے مفرد اور وصلی ہیں۔ کئی ذیلی جملے اسمی ہیں (جیسے سنو میری عمر ..... وغیرہ یا سنا کہ تمھارے پردادا یا فرماتے تھے کہ میں جنسی دھرکو۔ ... یا غرض بیان سے یہ ہے کہ۔ یا حاصل یہ ہے کہ .. وغیرہ وغیرہ) دو جملے استدراکی نوعیت کے ہیں (پھر آپس میں نامہ وپیام کی رسم نہیں، یا اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو...... وغیرہ وغیرہ)

جملوں کی ساخت اور طوالت میں اتار چڑھاؤ کا ایک دوسرا روپ یہ بھی ہے کہ چند ابتدائی جملے تو مشترک ہوں لیکن بعد میں آنے والے خبریہ جملوں کے فعل الگ الگ ہوں۔ اس طرح توازن اور تنوع کی آمیزش کے ساتھ ساتھ خطابت کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ علائی کے نام ایک خط سے یہ عبارت مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

> اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کمپ ہے مسلمان، اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو ۱

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۔

اس عبارت میں وصفی جملوں کی بہتات ہے جس سے بیان میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ مزید براں "یہ وہ دلی نہیں ہے" کی تکرار کے ساتھ توضیحی جملوں کا تنوع اور ان کی صوتی لہریں مل کر اسلوب کو جوش اور خطیبانہ انداز بخشتی ہیں۔ الفاظ کی تعداد درمیانی جملے میں بڑھتی جاتی ہے اور ایک خاص منزل پر پہونچنے کے بعد گھٹنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری جملہ "ایک کمپ ہے" صرف تین الفاظ پر مشتمل ہے جو موسیقی کی اختتامی جھنکار سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات گفتگو جملوں کے بجائے فقروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو دراصل جملے ہی ہوتے ہیں۔ جن سے اثر آفرینی کی خاطر فعل حذف کر دیئے جاتے ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس کی آخری سطر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غالب کے یہاں اس کی مثالیں عام ہیں۔ اس ضمن میں علائی کے نام ایک خط سے یہ جملے پیش کیے جاتے ہیں۔

قرض دینے والا ایک میرا مختار، وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے

مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار

جدا، سود جدا، مول جدا، بیبی جدا، شاگرد پیشہ جدا،

آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گذارا مشکل ہو گیا!

جملوں سے فعل کو حذف کر لینے سے نہ صرف اختصار بلکہ خطیبانہ روانی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ قاضی عبدالجلیل جنون کے نام ایک خط کے یہ جملے دیکھیے۔

کوئی تشکل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۷

نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت،
روح سے نفرت، یہ جو لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع
ہے۔ [1]

یا علائی کے نام یہ سطور دیکھیئے۔

اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں، عاشقانہ اشعار سے
مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ
تھا بھٹی کا کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف،
بھٹی متروک، نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔
پھر کہو کیا لکھوں؟ [1]

عام طور سے گفتگو میں تنوع اور حقیقت پسندی کا عنصر پیدا کرنے کے لئے معترضہ جملے مفید ہوتے ہیں۔ ان جملوں سے لکھنے والے یا بولنے والے کے ذہن کی سبک رفتاری اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن کامیاب معترضہ جملہ کے لئے ضروری ہے کہ اگر یہ اس قدر طویل نہ ہو جائے کہ اصلی مفہوم مبہم یا خبط ہونے لگے۔ چونکہ کامیاب جملہ معترضہ تنوع اور بعض اوقات تضاد کے ذریعہ اسی مضمون کو ابھارنے میں مدد دیتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ معترضہ جملے بکثرت نہ ہوں۔ ورنہ مرکزی خیال پر ان کے غالب آجانے کا احتمال ہے جو سلاست کے منافی ہے۔ چنانچہ جملہ معترضہ جملے کا چابکدستی کے ساتھ استعمال نثر نگار کی خود اعتمادی اور ذہنی چستی کے علاوہ اس کی نثری اسلوب پر مکمل قدرت کی دلیل ہے۔ غالب وصفی جملوں کے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۵۶

علاوہ کہیں کہیں معترضہ جملے بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں جس سے عبارت کی معنویت اور سلاست میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ایک دوسرے حوالے کے ضمن میں اوپر دیا جا چکا ہے تاہم معترضہ جملوں کے نمونوں کے طور سے اس کا اعادہ ضروری ہے۔

اب آپ فرمایئے حکیم کون ہے۔ ہاں دو ایک ڈاکٹر بہ اعتبار ہم قومیٔ حکام نامور یا کوئی ایک آدھ بید سو منزوی و گمنام بہرحال خاطر جمع رکھو۔ خدا کے فضل پر نظر رکھو، سبحان اللہ تم مجھ سے سفارش کرو امین الدین خاں کی، کیا میرے پہلو میں دل، یا میرے دل میں ایمان جس کو محبت بھی کہتے ہیں بقدر پرکشش و سرمو بھی نہیں ۱

یہاں یہ معترضہ جملے یا فقرے اظہار کو زیادہ موثر بناتے ہیں۔ بہ اعتبار ہم قومیٔ حکام نامور، سو منزوی و گمنام، جس کو محبت بھی کہتے ہیں، یہ جملے اگر عبارت سے نکال لئے جائیں تو مرکزی خیال تو ادا ہو جائے گا، لیکن اس میں وہ جذبہ نہ ابھر سکے گا جو پورے تراشے کی جان ہے۔ اسی طرح بہ اعتبار ہم قومیٔ حکام نامور بیان کا لازمی جزو ہیں لیکن اس میں مکتوب نگار کا صورت حال پر ہلکا پھلکا تبصرہ پوشیدہ ہے۔ اور یہ امر قابل غور ہے کہ غالب حکام پرستی اور انگریز دوستی کے باوجود ولایتی ڈاکٹروں کے معیار اور ان کی مہارت پر ہلکا سا طنز کیے بغیر نہ رہ سکے جس سے ان کی بنیادی مشرقیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح وید کی گمنامی گویا قدر ناشناسی کا ہلکا سا شکوہ ہے۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۶۹

ایک دوسرے مذکورۂ ماسبق اقتباس میں بھی معترضہ جملوں کے ذریعہ بیان میں وسعت اور دردمندی پیدا کی گئی ہے۔

امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار، سو روپیہ روز کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ [1]

یہاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، نانا نانی کی طرف سے امیرزادہ جو خود بھی بخشی ہے، وصفیہ جملے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ معترضہ بھی۔ اگر عبارت سے ان جملوں کو نکال دیا جائے تو اس کی روانی اور رزور بیان میں کمی محسوس ہوگی۔

علائی کے نام ایک خط سے بظاہر یہ غیر اہم جملے دیکھیے۔

نہ دن یاد نہ تاریخ، آج چوتھا یا پانچواں دن ہے کہ منشی نول کشور بسواری ڈاک رنگرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہونچ گئے ہوں یا آج پہونچ جائیں۔ [2]

اس اقتباس میں "یا پانچواں شاید بھول گیا ہوں" جملہ معترضہ ہے۔ لیکن اس

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۷۰۔۷۱

۲۔ ص ۸۹

نے تحریر کو تکلم اور حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے جو اس زمانے کی عام خطوط نگاری کی روش کے عین مطابق ہے۔ یہ امر قرینِ قیاس تھا کہ سادہ زبان کو ترجیح دینے کے باوجود بقول مرزا محمد عسکری

مرزا نے بھی روش زمانہ کے موافق مقفیٰ عبارت اپنے اکثر خطوط میں قائم رکھی۔ ۱

مرزا عسکری کے نزدیک اس قسم کے خطوط چالیس فیصدی ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ کوئی خط بھی مکمل طور سے باوزن یا مقفیٰ عبارت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کے صرف کچھ حصے اس طرز میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً نواب انورالدولہ شفق کے نام ۴ ۲ راگست ۱۸۶۰ء کے خط کے چار جملوں میں مسجع اسلوب برتا گیا ہے۔

غلہ کی گرانی، آفت آسمانی امراض دموی، بلاسے جانی۔ انواع واقسام کے اورام وبثور تنائج چارہ نا سودمند، اور سعی ضائع، میں نہیں جانتا کہ گیارہ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ ن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا بے بہ بے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت ساکنِ دلی ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ وبلا کا دروازہ باز ہے ۲

اسی طرح شفق کے نام ایک اور خط کے صرف ابتدائی حصے میں اس کی

۱۔ ادبی خطوط غالب مرزا محمد عسکری ص ۳۰

۲۔ خطوط غالب مہر ص ۲۶۳۔۲۶۲

مثال ملتی ہے۔

حضرت پیر و مرشد،

اگر آج سب دوست اور عزیز فراہم ہوتے
اور ہم اور وہ باہم ہوتے تو میں کہتا کہ آؤ اور رسم تہنیت
بجا لاؤ۔ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ
انوار الدولہ کا خط لایا۔ ۱

شفق کو ایک دوسرے خط میں بعض فنی اور لسانی مسائل پر رائے دینے سے
قبل دلی کی بربادی اور اپنی زبوں حالی کا تذکرہ مقفیٰ اور مسجع عبارت میں
کرتے ہیں۔

پنشن داروں کا اجرائے پنشن اور اہل شہر کی آبادی
مسکن یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے
اور جگہ سیاست ہے کہ منجانب ضروریات ریاست ہے۔
یہاں قہر الہٰی ہے کہ منشائے تباہی ہے۔ خاص میرے پنشن
کے باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ اخبار
روزگار حیران ہیں کہ یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے رپورٹ
کی روانگی کی دیر ہے۔ چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے
دلی علاقہ لفٹیننٹ گورنر سے انقطاع پا گئی اور احاطہ
پنجاب کے تحت حکومت آ گئی۔ رپورٹ یہاں سے
لاہور اور لاہور سے کلکتے جائے گی، اور اسی طرح پھر کھا کر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۵۵

نو ید حکم منظوری آئے گی۔ ۱

حکیم غلام نجف خاں کے نام ۱۱ر جنوری ۱۸۶۲ء کے خط میں تقریباً تمام خط مقفیٰ اور مسجع نثر میں ہے۔

کل آخر روز تمھارا خط آیا۔ میں نے پڑھا، آنکھوں سے لگایا۔ پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ ماکتبہ فیہ معلوم کیا ہوگا۔ تمھارے یہاں نہ ہونے سے جی گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے، کہو اب خیر سے کب آؤ گے۔ کے برس، کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے۔ یہاں کا خیال جیسا دیکھ گئے ہو بدستور ہے۔۔۔۔

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ توانگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا، عرق نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔ ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے ۲

میر مہدی مجروح کے نام مشہور خط (مورخہ ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء) میں بھی اس طرز کی کچھ لڑیاں سادہ نثر کے ساتھ پروئی ہوئی ہیں۔

تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔۔۔۔۔ نثر میں خودنمائیاں

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۵۰-۲۵۱

۲۔ ص ۲۷

کرنے لگے ..... کیا سحر طرازی کروں جو سخن پردازی
کروں ..... اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو ......
رودِ نیل بن گئے ہو ...... ہنسی کی باتیں ہیں .....
تمھاری دلی کی باتیں ہیں ...... حکم خاص و عام کچھ
نہیں ..... حاکموں کا کام کچھ نہیں ...... رہائی
ہوگئی چڑھائی ہوگئی ۔ ۱

اسی طرح مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط کا ابتدائی حصہ مقفی اور مسجع طرز میں ہے اور بقیہ خط میں سادہ اسلوب اپنایا گیا ہے دو اشعار کے بعد خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر، پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے۔ مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے، یہ بھی دلیل آشنائی ہے، کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہولے۔ اپنے کو بیگانہ یکدگر سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں۔ ۲

اس سلسلے میں مہر ہی کے نام ایک دوسرے خط کا حوالہ دینا مناسب ہے۔
میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔
ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۷۰
۲۔ ص ۲۱۰

لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنا تو کہو
کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط
نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ۱

اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ غالب نے اپنے دور کی مروجہ مراسلہ نگاری کے بوجھل اور بے کیف انداز کو ترک کر کے اپنے خطوط میں گفتگو کی کیفیت پیدا کر کے تازہ جان ڈالی ہے۔ تاہم وہ مقبول عام مقفیٰ اور مسجع اسلوب کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گاہ گاہ اس طرز کو تفننِ طبع کے طور پر عزیز رکھا ہے۔ مثلاً حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

بندہ پرور،
ایک خط کل پہونچا، آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا
کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کا بھی وقت آتا
ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو
غم و اندوہ کا شکوہ گذار پایا ہے۔ پس اگر کسی بیدرد پر
دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم نصیب
دوستاں درخورا فزائش ہے۔ ۲

مقفیٰ اور مسجع عبارت میں مزاح کا ایک اور نمونہ علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں دیکھا جا سکتا ہے، جس میں تقریب شادی میں اپنی غیر حاضری کا اس طرح

۱۔ خطوطِ غالب مہر ص ۲۱۹

۲۔ ص ۲۲۲

جواز پیش کیا ہے۔

دوجانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار!
یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنوں کا، جس سے تمھارے چچا کو گمان ہے
مجھ پر جنوں کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔
گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانے جا کر
شادی کماؤں۔ اور اس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو۔ لوبار و
بھائی کو دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے
کی گرمی بازار ہو۔ ۱

یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ مندرجہ بالا خط کا القاب بھی اسی انداز
میں ہے (یار بھتیجے گو یا بھائی مولانا علائی خدا کی دہائی) علائی ہی کے نام ایک
دوسرے خط میں یہ عبارت بھی اسی رنگ میں ہے۔

ناسازیٔ روزگار و بے ربطیٔ اطوار و بطریق داغ بالائے داغ
آرزوئے دیدار وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دنیائے
ناپیدا کنار۔ وقنا ربنا عذاب النار ۲

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے غالب کے خطوط میں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا استعمال
یا تو مروجہ مذاق کے زیر اثر ہے یا پھر مذاقاً لایا گیا ہے اور کہیں ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ یہ انداز مروجہ عبارت آرائی کے استہزار کے طور پر بھی اختیار کیا ہے۔
اس کے علاوہ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ غالب نے محض قدرت بیان کے اظہار

۱۔ خطوط غالب جلد ص ۲۲۲
۲۔ ص ۲۴۷

کے طور پر اس رنگ کو کبھی کبھی اپنایا ہے جس کا بالواسطہ ثبوت نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام وہ خط ہے جو فارسی نثر مرجز میں ہے۔ محرک جو بھی ہو اس میں شک نہیں کہ غالب کے اس انداز میں آورد کے بجائے آمد کا احساس ہوتا ہے۔ جو اس بات کی شہادت ہے کہ غیر شعوری طور سے مکتوب نگار کا ذہن موسیقیت اور الفاظ کی صوتی اور معنوی موزونیت کے احساس سے باخبر تھا۔

جملوں کے صوتی آہنگ کے شعور کے ساتھ غالب کو الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست و برخاست پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ یوں بھی ان کی زبان دانی اور بیان آفرینی مسلم ہے۔ لیکن الفاظ کے تنوع اور برمحل استعمال نے ان کی نثر کو سلیس، رواں دواں اور پرزور بنا دیا ہے۔ غالب کے پاس الفاظ کا وافر سرمایہ ہے اور انھیں ادائیگیٔ مفہوم کے ضمن میں الفاظ دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بیان کو یکسانیت اور سپاٹ پن سے بچانے کے لئے انھوں نے اکثر ہم معنی یا تقریباً ملتے جلتے مفہوم رکھنے والے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کی موزونیت اور برجستگی نے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔ ان الفاظ کی آوازوں کا تنوع اور اتار چڑھاؤ بھی اسے نئے حسن سے آشنا کرتا ہے۔ اس وصف کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

> استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور یہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، دعا اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد

کہلاتے ہیں بندگی، اور اس نظر سے کہ سید ہیں درود، ۱

یہاں وجہ کے واسطے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ ہیں راہ سے، رو سے سبب سے اور نظر سے۔ ایک ہی خیال اور رشتہ کو ادا کرنے کے واسطے متعدد مترادف الفاظ کے استعمال نے بیان میں پرکشش سلاست پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ ان الفاظ کی آوازوں اور وزن نے عبارت کے آہنگ کو ایک خاص کیفیت دی ہے۔ علائی کے نام دوسرے خط میں ایک اور مثال ملتی ہے۔

> توبہ توبہ۔ خط کاہے کو۔ ایک تختہ کاغذ کا میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ وبذلہ وشوخی وشوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ مخوائے عبارت سے جگر خون نہ ہوجاتا۔ بھائی کا غم جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور ایسا عیار وطراریوں عاجز و درماندہ واز کار رفتہ ہوجائے۔ ۲

یہاں بھی قریب المعنی الفاظ کے یکجا کرنے سے بیان کی روانی اور بالیدگی نکھر آئی ہے۔ مجروح کے نام ایک خط میں اس کا ایک مختصر نمونہ اس طرح آیا ہے۔

> کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی نہ بستا ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا اور نہ اپنا ہم تخلص بہم پہونچایا۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۶۲

۲۔ ص ۹۶

۳۔ ایضا

ان چند جملوں میں تقریباً ایک ہی معنی رکھنے والے تین اسمائے صفت (ہم نام، ہم عرف، ہم تخلص کے علاوہ ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کے لئے فعلی فقرے (ہونے دیا، بننے دیا، ہم پہونچایا) کلام میں مزید تنوع کا باعث ہیں۔

مندرجہ بالا تراشے میں شوخی کا انداز ہے تو اس خط میں (مجروح ہی کے نام) افسردگی اور بے بسی کی ایک جھلک دیکھیے۔

کہاں آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھیں، الور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرت اندوہ وغم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ کم ہے بفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے، سنتے ہیں نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ ہاں ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسے خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا ہے۔ ۱

رعایت لفظی کے علاوہ ہم معنی الفاظ کا استعمال توجہ طلب ہے۔ تپ، گرمی، یاس، اندوہ غم، فکر، خیال اور ملال یہ سب ہم معنی الفاظ کے جوڑے ہیں۔ لفظ عالم کی تکرار اور ذو معنویت نے شدت اظہار میں اضافہ کر دیا ہے۔ آخری جملوں میں انسان کی بے بسی کے ذکر اور مسئلۂ جبر و قدر کے بالواسطہ حوالے سے احول شناسی کے ساتھ ساتھ غالب کی دروں بینی کا پتہ چلتا ہے۔

---

۱ - خطوط غالب ۱/ ص ۲۰۴ - ۲۰۵

ایک اور جگہ اپنی بیزاری اور بے کیفی کا تذکرہ تفتہ سے اس طرح کیا ہے۔

بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں
نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام
وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش
نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، داروگیر سے محفوظ ہوں، کسی طرح
کی بازپرس ہو تو بلایا جاؤں، مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا
خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ ۱

یہاں فراری و روپوش، داروگیر اور بازپرس کے ہم معنی الفاظ کے استعمال اور ایک ہی مفہوم کی تکرار نے خط میں دل گیری کی لے پیدا کی ہے۔ مجروح ہی کے نام ایک اور خط سے یہ تراشہ ملاحظہ ہو۔

برسات کا نام آگیا تو پہلے مجملاً سنو، ایک غدر کالوں کا، ایک
ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت
وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی
جامع ہے۔ ۲

غدر، ہنگامہ، فتنہ، آفت، مصیبت، جیسے قریب المعنی الفاظ کو یکجا کرنے سے بیان میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ مزید براں الفاظ کی مختلف آوازوں نے مل کر آہنگ کو کچھ اور تیز کر دیا ہے۔ غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ایک مکتوب میں بھی اس خوبی کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔

۱۔ خطوط غالب ص ۱۴۵
۲۔ ص ۳۰۲

تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خاں بہادر
کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے۔ تم کیوں شکر
گزار ہوتے ہو۔ جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے
تمھارے ساتھ کی ہے۔ وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے اس
کا سپاس میں ادا کروں۔ خدا کی قسم دل سے دعائیں دے رہا
ہوں - ۱

رعایت اور عنایت ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ شکریہ، شکرگزار اور سپاس
بھی قریب المعنی الفاظ ہیں اور اسی طرح نیکی اور نکوئی بھی۔

قدر بلگرامی کو اپنی کیفیت سے آگاہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے
سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس
اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم میں تاب و تواں
نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف اردو سو اس میں عبارت
آرائی متروک جو زبان پر آوے وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب
میں ہے اور ہاتھ باگ پر۔ کیا لکھوں اور کیا کروں؟ ۲

تاب و تواں، موقوف اور متروک ہم معنی الفاظ کے جوڑے ہیں اور لکھنے کے
ساتھ یک قلم کا محاورہ زبان پر آنا اور قلم سے نکلنا دونوں محاورے ہیں۔
رکاب اور باگ لفظی اور معنوی رعایت کے حامل ہیں۔

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۵۵۴ - ۵۵۵

۲۔ ص ۵۲۹

چند جملے نواب انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں اس طرح مذکور ہیں۔

میں نے مانا جس کو تم نے لکھا ہے وہ لکھے گا کہ میں نے مختار سے پوچھا، اس نے یوں کہا۔ پھر میں نے یہ کہا۔ اب یہ بات قرار پائی ہے تو اس تقریر کو حضرت ہی باور کریں گے، فقیر کبھی نہیں مانے گا۔ ۱

باور کرنا اور ماننا یکساں روزمرہ ہیں اور اسی طرح رعایت لفظی کے ماتحت پوچھنا، کہنا اور بات قرار پانا آپس میں معنوی اعتبار سے متصل ہیں۔ اسی خط کے آخری حصہ میں یہ مختصر جملے بھی ملتے ہیں۔

ایک قاعدہ کلیہ دلی کا سمجھ لو۔ خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہو، مرد ہو یا عورت خفقان و مراق اس کی خلقت و فطرت میں ہو۔ ۲

قاعدہ اور کلیہ نزدیک المعنی الفاظ ہیں۔ خالق کے ساتھ قدرت کا استعمال رعایت لفظی ہے۔ اور خفقان و مراق اور خلقت و فطرت بین طور سے قریب المعنی الفاظ ہیں۔

ایک اور جگہ شفق کو ہی اپنی کیفیت اس انداز میں بیان کی ہے۔

افسوس کہ میرا حال اور میرا احوال آپ کی نظر میں نہیں ہے ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۳۶۶

۲۔ ص ۳۶۷

اور اس مرے ہوئے دل سے کیا کام کر رہا ہوں۔ نواب صاحب، اب
نہ دل میں وہ طاقت نہ قلم میں وہ زور، سخن گستری کا ایک ملکہ
باقی ہے۔ بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں
ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ۱

حال، احوال اور لیل و نہار تقریباً یکساں مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح بجھے ہوئے، ٹوٹے ہوئے اور مرے ہوئے' یہ فقرے ایک ہی کیفیت کے بیان کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ طاقت اور زور ہم معنی الفاظ ہیں۔ خیال، فکر، سخن گستری اور ملکہ رعایت لفظی کی اچھی مثالیں ہیں۔

شفق ہی کے نام ایک دوسرے خط سے یہ تراشا اسی خوبی کا مظہر ہے۔
میں عالم تصور میں آپ کو مسندِ عزوجاہ پر جانشین اور منشی نادر
حسین کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش
بجالاتا ہوں، اور منشی صاحب کو سلام عرض کرتا ہوں، کافر
نعمت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بجا نہ لاؤں۔ ۲

عزوجاہ، جانشین، جلیس اور کورنش و سلام ایک سلسلۂ خیال سے مربوط الفاظ مخصوص تہذیبی ماحول کی جھلک پیش کرتے ہیں جس کو خوبی کے ساتھ یکجا کرنے سے عبارت میں چستی پیدا ہو گئی ہے۔

شفق کے نام ایک دوسرے خط سے یہ مختصر سی مثال ملاحظہ ہو۔
سبحان اللہ! اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع اور ہمدرد پاتا

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۲۵۴
۲۔ ص ۲۶۱

ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی،
میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں سمرقند میں
دو چار یادشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر ہاں ،
اقربائے سببی۔ پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر
ہوں۔ اکسٹھ برس سے ستم اٹھائے ہیں۔ ۱

ہم طالع، ہمدرد، اور ہم قوم تقریباً ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کے لیے لائے گئے ہیں اور ان کی صوتی ہم آہنگی واضح ہے، عزیزوں، رشتہ داروں اور اقربا ہم معنی الفاظ ہیں ستم کشی اور ناخوشی بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ دام اور اسیر میں رعایت لفظی کا تعلق ہے۔ ہنگامۂ غدر میں کام آنے والے ہندوستانی اور انگریز دوستوں کی دل دوز داستان مرزا تفتہ کو سناتے ہیں۔

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا
ہوں، جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان
کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں جو ان روسیاہ
کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امیدگاہ
تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی
میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ
عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے
سب خاک میں مل گئے۔ ۲

بے رونقی اور تباہی، غم اور دکھ، امیدگاہ اور شفیق، دوست اور یار یہ ہم معنی الفاظ کے جوڑے ہیں۔ کالوں کے ساتھ روسیاہ کا استعمال رعایت لفظی

۱۔ خطوط غالب ج ۲ ص ۳۶۴
۲۔ خطوط غالب۔ مہیش پرشاد۔ ص ۳۸

کے ماتحت ہے اور سیاہ رنگ کا تعلق ماتم داری سے منسوب ہے۔ مجموعی طور سے الفاظ اور مفہوم کی تکرار نے ماتمی لے کو اونچا کر دیا ہے۔

غالب کو فارسی دانی پر اس حد تک ناز تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں میں امیر خسرؔو اور کسی حد تک فیضی کے علاوہ کسی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر فارسی میں شاندار کارنامے انجام دے کر اردو خطوط کی طرف توجہ دی تھی۔ چنانچہ اردو نثر ان کی پختہ عمر کا کارنامہ ہے۔ خطوط میں ان کے متعدد بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ "بے تامل اور بے فکر جو خیال میں آجاوے" کی سہولت اپنی زبان ہی میں ممکن ہے، فارسی سے ان کے شغف کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی اردو فارسی آمیز ہو۔ انیسویں صدی کے مروجہ غالب رجحان کی روشنی میں یہ آمیزش غیر متوقع نہیں سمجھی جا سکتی، چنانچہ فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال ان کے خطوط میں قابلِ توجہ ہے اس کی مثالیں اس قدر وافر ہیں کہ نمونے پیش کرنا چنداں ضروری نہیں تاہم ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے بیان میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اور لفظی تراکیب خط کے بے تکلف مکالماتی انداز کے سانچے میں مناسبت پیدا کرتی ہیں اس کی چند جھلکیاں غالب کے نثری اسلوب کے تجزیے میں ملتی ہیں۔

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام ۴ ستمبر ۱۸۵۸ء کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

پیر و مرشد!

یہ خط ہے یا کرامت؟ صفائے ضمیر و کشف جیب کی علامت ہے۔ مدعا ضروری التحریر اور اندیشہ نشان مسکن دامنگیر اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیوں کر لکھا جاتا؟ سبحان اللہ! جس دن یہاں مجھ کو وہ مطلب خطیر پیش آیا ہے اسی دن آپ نے وہاں لکھنے کو قلم اٹھایا

ہے۔ آپ کو عارف کامل کیوں کر نہ لکھوں اور کیا کہوں ولی نہ کہوں! مدعا بیان کرتا ہوں مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط پہونچنے نہ پائے گا کہ رازِ سربستہ آپ پر کھل جائے گا۔ ۱

خط کا ابتدائی حصہ فارسی تراکیب سے مزین ہے۔ صفائے ضمیر کشف جِب، مدعا ضروری التحریر اور اندیشہ نشانِ سکون کی تراکیب مخاطب کے لیے باعثِ تفنن ہیں۔ لیکن کہ اس سے آگے چل کر خط کی عبارت صاف اور سلیس ہو جاتی ہے۔

نواب انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں یہ تراکیب اور الفاظ ملاحظہ ہوں۔

پیر و مرشد،

شب رفتہ کو مینہ خوب برسا، ہوا میں فرطِ برودت سے گزند پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے۔ ابرِ تنک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے پر نظر نہیں آتا ہے۔ ۲

مینہ کے ساتھ شب رفتہ کی ترکیب غریب محسوس نہیں ہوتی۔ اسی سیاق و سباق میں فرط برودت کی ترکیب سے بھی تلاوت و تنوع کا عجیب پن نہیں محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ گزند کے ساتھ پیدا اور ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بے گزند کا استعمال بھی اجنبیت سے خالی ہے۔ اسی خط کے آخری حصے میں یہ چند جملے ملتے ہیں۔

بھائی ضیاء الدین خاں صاحب شملہ گئے ہوئے ہیں شاید آخر

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۲۱

۲۔ ص ۳۶۲

ماہِ حال یعنی جولائی یا اولِ ماہِ آئندہ یعنی اگست میں یہاں
آجائیں، آپ کو نویدِ تخفیف تصدیع دیتا ہوں۔ ۱

یہاں دو فارسی تراکیب آخرِ ماہِ حال اور خاص طور سے نویدِ تخفیف تصدیع نامانوس اور پرتکلف معلوم ہوتی ہیں جو ایک ثانیہ کے واسطے خط کے مکالماتی انداز پر گراں گذرتی ہیں۔ قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ایک مختصر خط میں آموں کے پہنچنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ جس میں فارسی اور عربی تراکیب سے آورد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

سبحان اللہ سرِآغازِ فصل میں ایسے ثمرہائے پیش رس کا پہونچنا نویدِ ہزارگونہ میمنت وشادمانی ہے۔ یہ ثمر رب النوع الثمار ہے۔ اس کی تعریف کیا کروں، کلام اس باب میں کیا چاہتا ہوں کہ میں یاد رہا اور اِدھر کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو بہ ایں ہمہ رواں پروری وکرم گستری ویادآوری سلامت رکھے۔ ۲

جنون کے نام آموں ہی کے سلسلے میں ایک دوسرا خط فارسی الفاظ اور تراکیب کا مجموعہ بن گیا ہے۔

عنایت نامہ کے ورود نے شادماں کیا۔ مگر امورِ مبہمہ جو نگارش پذیر تھے انھوں نے حیران کیا۔ ابہام کی توضیح اور اجمال کی تفصیل کا مشتاق ہوں۔ آموں کے باب میں جو کچھ لکھا یہ کیوں لکھا؟ اِدھر کو دعام کیا ضرور ہے؟ خصوصاً جب کہ بذاتِ خود حادث ہو۔ ۳

۱۔ خطوطِ غالب ج ۲ ص ۳۶۲
۲۔ ج ۲ ص ۵۲۵
۳۔ ص ۵۱۷

یہاں عربی اور فارسی الفاظ کی غرابت نے ابہامِ خیال میں اضافہ کر دیا ہے۔

اسی طرح نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے ایک خط کا یہ ابتدائی حصہ دیکھیے۔

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت۔
میں اس دولتِ ابد مدت کا از راہِ مودت خیر خواہ ہوں۔
اس ملال انگیز اندوہ آور میں آرائشِ گفتار گوارا نہیں کر سکتا۔
نواب مرزا نے دلی آکر پہلے نویدِ بزم آرائی سنائی۔ چاہتا
تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے از روئے خط
آمدرام پور حضرت جنابِ عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔
کیا کہوں کیا غم واندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے
کا تصور کر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ ایسے
مقام میں بطریقِ انشاء پردازی عبارت آرائی کروں،
نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقینِ صبر
شکیبائی کروں۔ ۱

غالب کے اظہارِ خلوص کے باوجود عبارت میں فارسیت اور اضافتوں کی کثرت نے تصنع اور ناہمواری کا انداز پیدا کیا ہے جو ان کے بیشتر خطوط کے لہجہ اور طرز سے میل نہیں کھاتا۔

شہاب الدین احمد خاں ثاقب نے محرقِ قاطع برہان کا ایک نسخہ علائی کو بھیجا تھا تاکہ وہ اس کی غلطیاں نکالنے میں غالب کی مدد کریں اور اگر ہو سکے تو ان کا جواب بھی دیں۔ اس کا تذکرہ ۸ رمئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں اس طرح ملتا ہے۔

۱۔ مکاتیب غالب - مرتبہ امتیاز علی عرشی ص ۱۷-۱۸

یہ رسالہ محرقِ قاطع برہان جو ناقب نے تم کو بھیجا ہے
میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ
ہے کہ اس کے معائنہ کے وقت اس کتاب کی بے ربطیٔ
عبارت اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر
نظر نہ کرو بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حَکَم
بنو۔ بے حیف و میل۔ اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں اس
پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی، شدت اطناب عمل
کی صورت، سوال دیگر، جواب دیگر، ان کتابوں کو مطمحِ
نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب
کو الگ الگ کاغذ پر لکھو اور بعدا تمام میرے پاس
بھیجدو۔ ۱

اس عبارت کے ابتدائی اور آخری جملوں میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ کچھ تو اس کا سبب فرمائشی لہجہ ہے اور کچھ زبان کی سادگی، لیکن درمیانی جملوں کو نسبت ہائے عدیدہ اور شدت اطناب عمل جیسی فارسی ترکیبوں نے بیان کو پر تصنع اور بے اثر بنا دیا ہے۔ تاہم فارسی الفاظ و تراکیب کے منفی اثرات کی مثالوں کی روشنی میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فارسیت نے ہمیشہ غالب کے خطوط میں تکلف اور تصنع پیدا کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ فارسی تراکیب کی بدولت عبارت میں تازگی اور معنویت فزوں ہوئی ہے۔ مثلاً علائی کے نام متذکرہ خط سے یہ تراشہ دیکھیے۔

بھائی میرے،
تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلبی

۱: خطوط غالب مہر ص ۹۱۔۹۲

بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں
اس کو اپنا یارِ وفادار اور ذریعۂ افتخار جانتا۔ میرے
خطوط کے نہ پہونچنے کا گلہ غلط۔ تمھارا کونسا خط آیا کہ
اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا۔ [1]

یہاں خالص ہندی الفاظ اور افعال کے ساتھ فارسی لفظوں اور تراکیب کی آمیزش سے جذبے کے وفور کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ ان الفاظ و تراکیب کے دروبست نے معنی کے علاوہ بیان میں گفتگو کے لہجہ کا زیر و بم بھی پیدا کیا ہے۔

فارسی پسندی اور ٹکسالی اردو پر اصرار کے باوجود غالب حسب موقعہ انگریزی الفاظ کو بھی اپنانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہ رویہ جہاں بعض انگریزی اصطلاحوں اور الفاظ کے ہندوستانی معاشرے میں راہ پاجانے کی دلیل ہے وہاں غالب کے کشادہ ذہن ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ کمشنر، گورنر، لفٹیننٹ، پنسن، ٹیکٹ، پارسل، لبر، پون ٹوٹی (ڈاؤن ڈیوٹی) گورنمنٹ، کونسل وغیرہ الفاظ موقعہ اور محل کے اعتبار سے ان کے خطوط میں اکثر استعمال ہوئے ہیں۔ جس کی ایک مثال دینا کافی ہے۔ تفتہ کے نام ایک خط سے یہ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب، ممالک مغربی کے مدرسوں کے
ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں
ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔ کیا اچھی بات
ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجے۔۔۔ پہلے میرا کلام پہونچ جائے
گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں، اور

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۰

سکریڑی کی نذر یہ پارسل انشاءاللہ تعالیٰ آج روانہ ہوجائیں
گے ۔ دیکھوں چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا
فرماتے ہیں؟ ۱

اس خط میں غالب کی حکام پرستی اور مطلب جوئی کا انداز نمایاں ہے جو ان کی مالی مجبوری اور کردار کے کمزور پہلو کی غمازی کرتا ہے۔ تاہم قدرتِ زبان کے باوجود انگریزی الفاظ کا خطوط میں موقعہ بہ موقعہ استعمال ان کی لسانی ترقی پسندی اور روشن خیالی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا ثبوت دوسرے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً پمفلٹ، پاکٹ، ٹکٹ گھر، بنیک گھر، گریمنٹ (معاہدہ) سرٹیفکٹ، ان میں سب سے دلچسپ مثال لیکور کا حوالہ ہے جسے غالب کے پرشوق بیان نے رعنائی بخشی ہے۔

لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قوام کی بہت لطیف
اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا کہ قند
کا قوام پتلا، دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں پاؤ گے۔
ہاں فرہنگ سروری میں ہو تو ہو۔ ۲

فنی مصطلحات کے استعمال نے غالب کی علمیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ہی متعلقہ خطوط کے اسلوب کو وزن اور وقار عطا کیا ہے۔ شفق نے دلی میں نظر آنے والے ستارۂ دُم دار کے متعلق استفسار کیا ہے۔ مکتوب نگار جس روانی اور بے ساختگی سے مطالبہ تفصیل بہم پہونچاتا ہے وہ معلومات کی وسعت اور خیال کی صراحت کا اچھا نمونہ ہے۔

آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۱۹۹

۲۔ ص ۲۸۱

ہے، ورنہ سوائے موزونیٔ طبع کے اور یہاں کیا رکھا ہے؟
بہر علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج
میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، تب سطح فلک پر یہ شکلیں
دکھائی دیتی ہیں۔ جس بُرج میں یہ نظر آئے، اس کا درجہ
و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں تب
ایک حکم نکالتے ہیں۔ سنّا۔ جہاں آباد میں بعد غروب
آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا ہے۔ اور چوں کہ ان
دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ
یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت کی حقیقت
نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی
دھوم رہی اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں بھی
شاید نظر آیا ہے۔ جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے۔ بس
میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں
ملک کی تباہی کی ہیں۔ قرآن النحسین، پھر کسوف، پھر
خسوف، پھر یہ صورت پُر کدورت، عیاذاً باللہ و پناہ
بخدا: ۱

غالب کو طبی معلومات میں کافی درک تھا، ان کے عہد میں اشخاص کا مروجہ
علوم سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ عمر کے اواخر میں
غالب کی بیماریوں نے انھیں تشخیص ادویہ اور معالجہ کا ذاتی تجربہ دیا تھا۔
چنانچہ غالب کے عیادت ناموں بالخصوص منشی نبی بخش حقیر اور علائی کے
نام بعض خطوط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ حقیر کی بیماری کا احوال سُن کر کبھی

۱۔ خطوط غالب ج ہ ص ۲۵۱۔۲۵۲

انھیں چوب چینی کا پانی پینے کا مشورہ دیتے ہیں اور کسی دوسرے موقعہ پر ریم کی مستی پینے کا مشورہ دیتے ہیں اور ترکیب استعمال سے آگاہ کرتے ہیں۔

۱۵ فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں علائی کے والد (امین الدین احمد خاں) کی علالت کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اس طرح تسلی دیتے ہیں کہ مرض بوجہ افیون خواری ہے ہے جسے پیرانہ سالی نے اضافہ کر دیا ہے۔ اطبا کے اوصاف میں حکیم امام الدین نظری کی تعریف کی ہے اور حکیم احسن اللہ خاں کی عملی میں۔ نظری اور عملی دو طبی اصطلاحات ہیں۔ اسی طرح سوئے مزاج، ساذج، مادی، مادۂ باردہ، تنقیہ، مخرجات بلغم، عیارج کا مسہل وغیرہ کا بالتفصیل تذکرہ ہے۔ اسی ضمن میں اگلے خط میں نقوع دجوب کا ماہرانہ حوالہ بھی ملتا ہے۔

ان مصطلحات کے استعمال نے خطوط میں حقیقت پسندی اور مکتوب نگار کی باخبر شخصیت کی چھاپ لگا دی ہے جس کا اثر اسلوب کی تاثیر پر پڑا ہے۔

نجی خطوط میں مکتوب نگار بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کے روبرو زندگی کے شب و روز کی روداد بیان کرتا ہے۔ ان ذاتی تجربات کے بیان کے لئے زبان بھی سادہ ہے۔ غالب کو اپنے خطوط کے مکالماتی لب ولہجہ پر یوں بھی ناز تھا۔ چنانچہ ان کی علمیت وسعت معلومات اور فطری مشکل پسندی کے باوجود مکتوبات میں بے ساختگی اور روانی کا انداز نمایاں ہے جس کو روزمرہ اور محاورے کے استعمال نے اور بھی نکھار دیا ہے۔ کبھی فارسی تراکیب سے مزین عبارت میں محاورں اور روزمرہ کی آمیزش بیان کو دل چسپ رنگ دے دیتی ہے مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط سے یہ چند جملے بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز

باتوں نے غم بے کسی بھلایا[1] کہاں دھیان لڑا ہے۔ کہاں سے دستنبو کی مناسبت کے واسطے ید بیضا ر ڈھونڈنے لایا ہے۔ یہاں مہربانی نامہ، مہرانگیز اور محبت خیز کی فارسی تراکیب اور صنعت کے علاوہ دھیان لڑانے کے محاورے نے لطف دوبالا کر دیا ہے۔ اسی خط میں یہ چند جملے بھی ملتے ہیں۔

مرزا تفتہ کا ہاتھرس سے خط آیا ہے، ان کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ آئے گئے آئے ہیں۔ اگر تمھیں بغیر ان کے آرام نہیں تو ان کے بغیر تمھارے چین کہاں؟[1]

یہاں بھی لڑکے بالے اور آئے گئے کے آئے روزمرہ ہی سے لئے گئے ہیں یہ مہدی مجروح کے نام ایک دوسرے خط سے یہ بولتا ہوا تراشہ بھی اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں، میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت، بلا اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اچھلتے، کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے کیا غضب ہوا کہ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں[2]

اس مختصر عبارت میں ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اچھلتے، کودتے پھرتے ہیں۔ ہے ہے کیا غضب ہوا وغیرہ بھی روزمرہ ہی کی مثالیں ہیں اور ان سے بیان میں سلاست روانی اور بے تکلفی کا رنگ نکھر گیا ہے۔

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۳۱۲
۲۔ ص ۲۶۹

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کبھی کبھی غالب فارسی تراکیب اور اردو بول چال کے ملے جلے انداز سے بھی اپنے اسلوب کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فارسیت اور روزمرہ کی آمیزش اور روزمرہ کا نمونہ میر مہدی مجروح کے نام اس خط کے ابتدائی حصہ میں دیکھیے۔

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے، ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس دبے تو ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔ [1]

یہاں بھی فارسی الفاظ اور صوتی ہم آہنگی (ملک و مال، جاہ و جلال) اور ہم وزن و ہم قافیہ الفاظ (گوشہ و توشہ) کے ساتھ ساتھ مار ڈالا اور ہنس بول لیتے تھے کے ہونے نے پیکر لفظی میں جان ڈال دی ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو غلام حسین خاں کے سفر اور بیماری کی اطلاع میں روزمرہ کا ایک ادا استعمال دیکھیے۔

جب میاں خاں اور وزیر خاں روانہ ہو لیں گے اور منشی امداد حسین مجھ کو اطلاع دیں گے تو میں ذرا چل دوں گا۔ پابہ رکاب ہوں۔ کل ہی اٹھم روز غلام حسن خاں آئے۔ کل انھوں نے جو تھے دن کھانا کھایا تھا ہیضہ ہو گیا تھا۔ قے متواتر دست پے بہ پے۔ غرض بچ گئے کہتے تھے کہ آج جولائی کی سترہ تاریخ ہے۔ تیرہ دن یہ اور پانچ دن اگست کے اور نہیں جا سکتا۔ تنخواہ سے کم بانٹ بونٹ کر ایک دن پھر دوں گا۔ دوارو کی راہ لوں گا۔ [2]

محاوروں (پابہ رکاب اور راہ لینا) کے علاوہ روزمرہ (بانٹ بونٹ) نے بیان میں

---

1 خطوط غالب مہیش پرشاد ص ۲۵۰ ۔ 2 ص ۲۷۰

بے ساختگی پیدا کی ہے۔ اردو خطوط کی اشاعت کے سلسلے میں غالب نے علائی سے اپنے خطوط منگئے ہیں۔ علائی بہ نظر احتیاط اس قیمتی سرمایہ کو کپڑے کے سربمہر پارسل میں روانہ کرتے ہیں جس پر ڈاک کی مروجہ شرح کے مطابق خاصی رقم بطور تاوان ادا کرنی پڑتی۔ محض دوستی کی رعایت سے وہ اس زیر باری سے بچے۔ اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

میاں ان خطوط کے ارسال میں تم نے مجھے وہ کیا جو میں نے تم سے دو جلدوں میں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیرِ خرف ہوں اور رہینِ خرافت کو نسیان لازم ہے۔ تم نے کیا سمجھ کر کپڑا لپیٹ کر مختتم کر کے بھیجا۔ اگر منشی بہاری لال میرا اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتا تو پچاس روپیہ مجھ کو دھتیا لگتا۔

اس عبارت میں فارسی اور عربی الفاظ پیرِ خرف، خرافت، مختتم اور ثقیل العرض کے ساتھ روزمرہ میاں اور بھلا اور محاورہ دھتیا لگنا کے استعمال سے ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام یہ خط بھی روزمرہ اور فارسیت کے امتزاج کا ایک نمونہ ہے۔

اور میرے پاس اس قول کی، اس راہ سے کہ مولوی صاحب آپ کے ہم نشین و ہم دم تھے اور مجھ میں اور آپ میں پیوند ولائے روحانی محقق ہے آپ بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مجھ میں اور ان میں رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ

۱۔ خطوطِ غالب۔ مہر ص ۸۵

ہوئے۔ اب سنئے حال منشی حبیب اللہ کا، میں ان کو دیکھا تو آنکھیں
پھوٹیں۔ ۱

ان چند جملوں میں تفصیل عربی اور فارسی الفاظ کے بوجھل پن کو روزمرہ (گواہ ہونے) اور محاورے (آنکھیں پھوٹیں) نے کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال علائی کے نام ایک خط سے پیش کی جاتی ہے۔

میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ تین قصیدے
کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے
کہے گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔ نا صاحب، دہائی خدا کی۔
میں نہ تاریخ ولادت کہونگا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ ۲

یہاں چل دئے، سنبھل سکے، پرے پہونچا، اور دہائی خدا کی، جیسے روزمرہ اور محاورے سلاست اور روانی کی جان ہیں۔ کہیں عبارت کے مختصر ٹکڑے میں کئی محاوروں کو یکجا کر دیا ہے جس سے تحریر بول اٹھی ہے۔ مثلاً قاضی عبدالجمیل جنون کے نام کے خط میں ابتدائی چند جملوں ہی میں یہ محاورے ملتے ہیں۔

فارسی کیا لکھوں۔ یہاں ترکی تمام ہے۔ مرنا سر پہ کھڑا ہے۔
پا بہ رکاب ہوں۔

اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام ایک خط (نمبر ۲۰) کے پہلے جملے میں یہ ضرب المثل توجہ مبذول کراتی ہے۔

میری جان، تو کیا کہہ رہا ہے۔ بنئے سے سیانا سو دیوانا۔

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۳۳۸

۲ ص ۵۸

اس میں مخاطب کو مشورہ دینے پر ہلکی سی فہمائش کا پہلو مضمر ہے۔ اسی خط میں
دو اور محاورے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

نہ پوچھو اس پنشن قدیم کا حال! میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں
لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے
آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھئے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے
یا نہ بلائے۔ خلعت ملے یا نہ ملے۔ اس پیچ میں ایک اور پیچ آپڑا ہے۔ ۱

ہاتھ دھو بیٹھنا اور پیچ میں پیچ آپڑنا معنی خیز محاورے ہیں جس میں موخر الذکر لفظ کی
تکرار دلکشی کا باعث ہے۔ اور محاوروں کی موزونیت کے بدولت مضمون میں
چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔

ہندی محاورے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ مکتوب نگار دلی کی بربادی کا
ماتم کرتے ہوئے مجروح کو لکھتا ہے۔

نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ
سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخن وری رہی
نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتا پانی ۲

اسی طرح کلیجہ پکا دینے کے محاورے کو رباعی نما خط میں یوں باندھا ہے۔

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ثاقب یہ کی ہے حرکت بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکھئے بے وجہ جواب غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

جواب بھیجنا اور کلیجا پکا دینا روزمرہ اور محاورہ بندی کی برجستہ مثالیں ہیں۔

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۸۴
۲ ص ۲۹۴

غالب نے حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں اپنے عہدِ شباب کے رنگ و روپ کو اس طرح یاد کیا ہے۔

بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ۱

نفس مضمون کے سیاق و سباق میں یہ محاورہ (چھاتی پر سانپ سا پھر جانا) برمحل اور برمعنی ہے۔ اس عبارت کے فوراً بعد خونِ جگر کھانے کا محاورہ بھی مکتوب نگار کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے ایک دوسرے خط میں غالب علائی کو ان کے والد کی ناسازئ طبع پر ضمن میں تسلی دیتے ہوئے توہم پرستی نیز خود غرض عاملوں اور ملاؤں سے بچنے کا مشورہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

اسماء و آیات شفا بخش سچ ہیں۔ ورد سحر و دفع بلا ان کے ذریعہ سے منصور ہے۔ لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تہہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بگھارتے ہیں۔ ۲

یہ محاورے (تہہ توڑنا اور باتیں بگھارنا) سونے پر سہاگے کا کام کر رہے ہیں۔ بعض دوسرے خطوط میں روزمرہ اور محاوروں کو حسن و خوبی کے ساتھ

---

۱ خطوطِ غالب مہر ص ۲۳۲

۲ ص ۹۰

استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے عصمت بی بی بے چادری، گنگا جلی ہاتھ میں لینا، سر پہ قرآن رکھنا، کھیل بگاڑنا، صدقے جانا، نثار کرنا وغیرہ۔ عربی فارسی اور ہندی محاوروں کے علاوہ کم از کم ایک موقع پر غالب نے ٹکسالی اردو میں ایک پنجابی محاورہ بھی آمیز کیا ہے۔ شیو نرائن آرام کے مشورے پر کہ وہ انگریز حکام کی توجہ مبذول کرانے کے لیے کچھ اردو میں لکھیں (جس کی فرمائش ان سے ہنری اسٹورٹ ریڈ نے کی تھی) مکتوب نگار یوں معذرت کرتا ہے۔

میاں اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو۔ خیر ہوئی اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنسن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پئیں روٹیاں تو سبھی گلاں ہوتیاں۔

اس محاورے سے مکتوب نگار کی ذہنی پراگندگی اور معاشی ناآسودگی کو بڑے پر درد انداز میں سمو کر اپنی بیزاری اور بے زری کی کیفیت کو واضح تر کر دیا ہے۔

غالب نے فارسی نظم و نثر میں معنی آفرینی اور عبارت آرائی کی تخلیق و تعمیر میں وہ عمر بسر کی تھی جس کی بدولت وہ لفظ و معنی کے نازک رشتے کے ادا شناس بن گئے۔ چنانچہ جب وہ سہل نگاری کی خاطر فارسی خطوط نویسی کو ترک کر کے اردو کی طرف مائل ہوئے تو یہاں بھی لفظ و معنی کے ارتباط سے نئی صورتیں وضع ہوتی چلی گئیں۔ ان میں سے بعض صنعتوں نے مخاطب تک بڑی خودی کے ساتھ رمزی اور ایمائی کیفیتیں منتقل کیں۔ سید عابد علی عابد نے غالب کی شاعری کی صناعانہ صلاحیتوں کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالب کے یہاں صنعتیں بہت کم استعمال ہوئی ہیں کہ اسے الفاظ کی صنعت گری سے بچے معانی کی نزاکت

کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خیال بالکل غلط
ہے۔ غالب نے بھی صنعتیں بہت کثرت سے استعمال کی ہیں۔
لیکن ایسی خوبی سے استعمال کی ہیں کہ مخل معنی ہونے کے بجائے
معاون ہوتی ہیں اور جب ان کی طرف توجہ دلائی جاتی ہیں تو ایک
خاص قسم کا انبساط حاصل ہوتا ہے [1]

یہی صورت حال غالب کی اردو نثر میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض صنائع
بدائع کی نشان دہی اسلوب کے خد و خال سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔
شاعری میں صنعت مبالغہ عام ہے۔ لیکن نثر اور روزمرہ کی گفتگو میں بھی
اس سے مراد لی جاتی ہے۔ لوگ اکثر و بیشتر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے
چیزوں کو غیر شعوری طور سے گھٹا یا بڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن غالب کے
بے تکلف خطوط میں ان کی شاعرانہ مشاقی فطری مبالغہ کے استعمال سے ایک
نیا ڈھنگ اور آہنگ پیدا کرتی ہے۔ وہ انور الدولہ شفق کو اپنی بیماری کا احوال
سپرد قلم کرتے ہیں۔ اس میں ایک مخصوص سلسلۂ خیال کی توضیح کے لئے الفاظ اس
طرح مجتمع ہو گئے ہیں جنھوں نے لف و نشر، مراۃ النظیر اور مبالغہ کی صنعتوں کی
رونمائی کی ہے۔

مختصر یہ کہ سر سے لے کر پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم،
ہر زخم میں ایک غار۔ ہر روز بے مبالغہ نیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم
درکار۔

اسی خط میں آگے چل کر یہ جملے ملتے ہیں۔

---

[1] اصول انتقاد ادبیات اردو۔ سید عابد علی عابد ص ۲۲۹

اجل نے بیری سخت جانی کی قسم کھائی ہے۔ اب اگرچہ تندرست
ہوں۔ لیکن ناتواں اور سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا ہوں حافظے
کو رو بیٹھا ہوں۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں کہ جتنی دیر میں کہ
آدم دیوار اٹھے ۱

ان جملوں میں جہاں ذہن کی درّاکی جھلکتی ہے وہاں مزاج کی ہلکی سی لطافت بھی لذت افزو ہے۔ لیکن مبالغہ کا تسلسل اور اٹھان سب سے زیادہ لائق توجہ ہے۔ زخم کا غار ہونا واضح ہے۔ لیکن دوسرے اقتباس میں ناتوانی اور سستی کی حالت سے بڑھ کر حواس کھو بیٹھا اور پھر حافظے کا معطل ہونا مبالغہ کی لَے کو بتدریج تیز کرتے ہیں جس کا تکملہ اس غلو پر ہوتا ہے کہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں اتنا وقت درکار ہے جتنی دیر میں کہ قد آدم دیوار تعمیر ہوتی ہے۔ مبالغہ مکتوب نگار کی بے چینی اور بیزاری کے علاوہ خود استہزائی کیفیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ عبارت کی زیریں سطح پر محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کا مدعا مخاطب سے ہمدردی کے حصول کے بجائے اپنے احساس تنہائی کو زائل کرنا ہے جس کی خاطر سلسلۂ گفتگو دراز ہوا ہے۔

مکتوب نگار ایک دوسرے خط (بنام حکیم غلام نجف خاں) میں مکان کی مجوزہ تبدیلی کا تذکرہ اس انداز سے کرتا ہے۔

اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے دروازہ
وہ تاریک کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے۔

لفظی رعایتیں معنوی تلازمے میں معاون ہیں۔ دن اور چراغ کی نسبت سے مبالغہ ایک عام صنعت ہے۔ لیکن تنگ گلی کے اندر تاریک دروازہ پر دن میں چراغ کے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۳۶۸ - ۳۶۹

غلو آمیز مبالغہ نے اس کو عمومیت سے بالا کر دیا ہے۔ اسی طرح میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں رام پور کے دریائے کوسی کے پانی کی تعریف و توصیف مبالغہ پر مبنی ہے۔ لیکن یہ مبالغہ بے جان اور مصنوعی نہیں ہے۔ بلکہ اس نے دوسری صفتوں (حسن تقابل، لف ونشر، تلمیح وغیرہ) نیز ہلکے سے استفہامیہ انداز کی شمولیت سے عبارت کو لطف و رنگینی سے مزین کر دیا ہے

> سبحان اللہ، شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ [1]

دریائے کوسی کو چشمۂ آب حیات سے نسبت دی گئی ہے۔ پھر اس کے پانی کو شیرینی کی وجہ سے آب حیات سے بہتر گردانا ہے۔ اس طرح مبالغہ کی یہ صفت کثیر المدارج ہو گئی ہے۔

متضاد معنی رکھنے والے الفاظ کے استعمال سے چونکانے اور توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے صنعت تضاد کا استعمال شاعری میں لطف کا باعث ہوتا ہے۔ عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے نثر میں بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہی تضاد طنز کی بھی بنیاد ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ غالب کے خطوط میں صنعت تضاد کا استعمال برجستہ اور موثر انداز میں ملتا ہے۔ وہ مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں عربی زبان کے ضمن میں علما سے سند مانگنے کی عادت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۹۰

میں عربی کا عالم نہیں۔ مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس
زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علما سے پوچھنے کا محتاج اور
سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ ۱

عالم اور جاہل کا ایک ہی جملے میں استعمال تضاد پر مبنی ہے، اور معنوی طور سے
اگلے دو جملوں میں بھی محقق اور محتاج میں ایک طرح کا تضاد پنہاں ہے۔
اس کے علاوہ محتاج اور طلب گار کی معنوی مطابقت مزید خوبی پیدا کر دیتی ہے
تضاد کی ایک اور مثال تفتہ ہی کے نام ایک دوسرے خط میں ملتی ہے جس میں
مکتوب نگار غدر کے فوراً بعد اپنی بدحالی اور مالی پریشانی کے ضمن میں یہ جملے
سپرد قلم کرتا ہے۔

نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین، نہ آفرین، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف
نہ قہر، پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔
اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ ۲

یہاں جزا، سزا، عدل، ظلم وغیرہ متضاد معنی رکھنے والے الفاظ کے ساتھ
اگلے جملے میں دن اور رات کا تضاد بھی اس تاثیر کو اور گہرا کرتا ہے۔ تقریباً اسی
کیفیت کا اظہار تفتہ ہی سے ایک دوسرے خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں زندہ ہوں، اودھ کے نمبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے وہ بہ
اعتبار ترک اصلاحِ نظم لکھا ہے۔ ورنہ زندہ ہوں مردہ نہیں۔
بیمار بھی نہیں، بوڑھا، ناتواں، مفلس قرضدار، کانوں سے بہرہ،

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۹۰
۲ ؍؍ ص ۱۲۸

قسمت کا بے بہرہ ، زیست سے بیزار مرگ کا امید وار ۔ ۱

ان جملوں میں زندہ ، مردہ ، زیست ، مرگ ، بیزار ، اور امید وار صنعت تضاد کی مثال پیش کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی بیمار ، بوڑھا ، ناتواں ، مفلس ، قرضدار وغیرہ صنعت تضاد سے متعلق ہے ۔ اس طرح مختصر سی عبارت میں تضاد اور طباق کی آمیزش نے نہ صرف فنی خوبی پیدا کردی ہے ، بلکہ اس کے توسط سے مکتوب نگار کی ذہنی کیفیت ، مایوسی اور بے بسی کی مکمل عکاسی بھی ممکن ہوئی ہے ۔ غالب قاضی عبدالجمیل جنون کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

> فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے جو حکم آپ کا ہوتا ہے اس کو بجا لاتا ہوں ۔ مگر معدوم کو موجود کرنا میری دست قدرت سے باہر ہے ۔ اس زمین میں کہ جس کا آپ نے قافیہ اور ردیف لکھا ہے ، میں نے کبھی غزل نہیں لکھی ۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے کس سے اس زمین کا شعر سن کر میرا کلام گمان کیا ہے ۔
> ہر چند میں نے خیال کیا اس زمین میں میری کوئی غزل نہیں ۔ ۲

یہاں پر معدوم اور موجود کا تضاد عیاں ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ صنعت طباق کی مثالیں بھی موجود ہیں ۔ حاضر اور غیر قاصر ، گمان اور خیال ہم معنی الفاظ ہیں ۔ مکتوب نگار حکیم غلام نجف خاں سے معذرت کے حالات کے استفسار کے ضمن میں مندرجہ ذیل سوالات حاصل کرنے کا خواہشمند ہے ۔

> یہ تو معلوم ہوا بعد نقل ہونے دس آدمی کے ، کہ وہ اس میں عزیز بھی تھے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۰۶

۲ ص ۵۱۳

یہ سب وہاں سے نکالے گئے۔ مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکر نکلے؟
پیادہ یا سوار؟ تہی دست یا مالدار؟ مستورات کو رتھیں دی گئی
تھیں۔ ذکور کا حال کیا ہوا؟ اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا؟ [۱]

پیادہ، سوار، تہی دست اور مالدار، مستورات اور ذکور تضاد کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں وہ گیرائی بھی پنہاں ہے جو پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تضاد و طباق کے لیے جلے خیال افروزی کا چھوٹا سا نمونہ مرزا حاتم علی مہر کے نام اس خط میں دیکھئے۔

اے لکھنؤ کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال
کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے۔ خاندان شجاع الدولہ کے زن
و مرد کا کیا انجام ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟
گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت سب کے تم کو زیادہ آگہی ہو گی امیدوار
ہوں جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ [۲]

یہاں زن و مرد، گمان و آگہی، معلوم و مجہول متضاد الفاظ کے معنیٔ مطلوب کے چہرے سے پردہ سرکا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انجام، سرگزشت، کھلنا، معلوم ایک ہی سلسلۂ ربط کی کڑیاں بن گئی ہیں۔

علائی کے نام مندرجہ ذیل خط کا حوالہ اس سے قبل بھی آ چکا ہے۔ اب کی شناخت کے سلسلے میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۳۰۷
۲ ص ۲۱۱

خدا نے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑھاپے اور میری بیکسی پر
رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا
تھا بواسیر خونی، زحیر، تپ، صداع، بارے اب من کل الوجوہ صحت
حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کو قسے قوی تھے کہ اب
ان کو ضعیف کہا جائے۔ ۱

مندرجہ بالا عبارت میں صحت، ضعف، قوی اور ضعیف متضاد کیفیات ہیں اسی
میں طباق کی بھی جھلک ملتی ہے۔ بے کسی، ضعف، بچ گیا، گھر گیا، بڑھاپا
اور بیکسی میں معنوی مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان کے امتزاج نے اظہار کو حقیقت
پر در بنا دیا ہے۔

صاحب عالم مارہروی کے نام خط سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

پیر و مرشد،

اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیوں کر بجالاؤں؟
خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصانِ درگاہ
سے بھلا کہلواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی
کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ گیا اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی
کو یوں بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہونچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن
قرار دیتا ہوں۔ اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں۔
واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمایئے گا۔ ورنہ بندہ دعویٰ خدائی
کرنے میں محابہ نہ کریگا۔ ۲

۱۔ خطوط غالب مہر ص ۹۶
۲۔ ص ۵۰۷

اس عبارت میں جو خوش مزاجی اور شگفتگی کی لہر دوڑ رہی ہے اس کے لطف کو رعایت لفظی کے مسلسل اور بے ساختہ استعمال نے دو چند کر دیا ہے۔

علائی کے نام ایک خط میں رام پور کے جشن کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سا ماں کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع، اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہئے۔ ۱

یہاں طوائف کی رعایت اور طوائف الملوک کی ذو معنویت قابل داد ہے اور تجنیس لفظی کی اچھی مثال ہے

کون کہتا ہے کہ میں قید سے رہا ہوا ہوں، پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں

یہاں گورے اور کالے میں تضاد ہے۔ اس کے علاوہ کالے کا لفظ ذو معنی رکھتا ہے۔ یہاں کالے رنگ سے مراد نہیں ہے بلکہ کالے شاہ صاحب کے مکان کا ذکر ہے۔ یہاں ایہام تناسب سے کام لیا گیا ہے۔

علائی کے نو عمر بیٹے امیر الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں۔ ۲

اوپر دی ہوئی مثالیں صرف نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ بیشتر خطوط سے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۰۰

۲ ص ۱۱۱

ان کے مزید نمونے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ تکرار لفظی بیان میں زور اور لطف پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ جس نے بعض صورتوں میں گفتگو کے لہجہ کو خطابت میں بدل دیا ہے۔

شاعر اور انشا پرداز توضیح کلام اور تشریح معانی کے لئے تشبیہ اور استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے کی غایت پر روشنی ڈالتے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

ایسے جذبات، واردات، افکار اور تصورات کا بیان جن کا ابلاغ و اظہار اس لئے ممکن ہے کہ پڑھنے والے پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی جس سے فن کار متکیف ہے تو انشا پردازیا فن کار یا شاعر تشبیہ اور استعارے کا دامن تھامتا ہے۔ اور معروف کوائف و اشیاء کا ذکر کر کے غیر معروف کیفیات و تصورات کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ [1]

بیان کی توضیح کے لئے دو مماثل چیزوں کو یکجا کر کے ان کے موازنے سے معنویت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ اچھی تشبیہ کی ایجاد کے لئے ذہانت کی ضرورت ہے۔ غالب نے خطوط نویسی کی بساط ویرانۂ دل کو آباد کرنے اور خلوت میں جلوت کا سماں باندھنے کی خاطر بچھائی ہے اس کے لئے حرف و حکایت کو طول دینا ضروری تھا۔ تاکہ گفتگو سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا ممکن ہو۔ بنیادی طور سے تشبیہ اس مطالبے کی تکمیل کرتی ہے۔ غالب کے خطوط میں تشبیہات خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

---

۱ اصول انتقاد ادبیات۔ سید عابد علی عابد ص ۲۱۷

مرزا تفتہ کو ان کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں اپنی ترک شاعری کی خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

> میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ ۱

سن رسیدہ پہلوان سے متعلق اس تشبیہ میں عمومیت ہے۔ لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی کے فرق کے حوالے سے اس میں گہری معنویت اور صداقت ابھری ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرے خط میں مرزا تفتہ کے سامنے اپنی فارسی دانی کی فضیلت کا دعویٰ یوں کرتے ہیں:

> فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ ۲

یہ تشبیہ بھرپور حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔ اور اپنی کیمیادی بنیاد (فولاد، جوہر) کے باعث عام ڈھنگ سے کچھ الگ ہے کبھی تشبیہ میں مبالغہ کا عنصر بھی داخل ہو گیا ہے۔ مثلاً مرزا حاتم علی کو ایک خط میں منشی شیو نرائن کی بھیجی ہوئی دستنبو کی تینتیس جلدوں کے پہونچنے کی رسید دیتے ہوئے ان کے حسن طباعت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۴۸

۲ ص ۱۹۰

کہ طلائی کام پریہ کتابیں طاؤس ہا بہشت بن جائیں گی حوریں ان کو
دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست مگر دیکھئے مجھ کو ان کا دیکھنا
کب تک میسر ہو۔ ۱

اس شاعرانہ تشبیہ میں وجہ شبہ انفرادیت آمیز ہے۔ اُن دیکھے طاؤس بہشت کا مطلا کتابوں کی عدم وصولیابی کے تعلق نے خاص حسن پیدا کیا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو رام پور سے اپنی مراجعت اور دلی میں ورود کی اطلاع اس دلچسپ تشبیہ کے ذریعہ دیتے ہیں۔

آٹھ جنوری ماہ و سال حال دو شنبہ کے دن غضب الٰہی کی
طرح اپنے گھر میرا نازل ہوا۔

تشبیہ کے تیور تیکھے ہیں اور تاریخ، ماہ، سال اور دن کی نشان دہی گویا ایک زبردست حادثے کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اپنی واپسی کو عذاب الٰہی سے تعبیر کرنا جہاں شوخی کی دلیل ہے وہیں اس ذہنی کوفت کو بھی ظاہر کرتی ہے جو رام پور سے واپس ہوتے ہوتے راہ میں علالت کے باعث مکتوب نگار نے برداشت کی تھی۔

مکتوب نگار انور الدولہ شفق کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

ایک نوازش نامہ آیا اور دستنبو کے پہنچنے کا مژدہ پایا۔ اس کا جواب
یہی کہ کارپردازان ڈاک کا احسان مانا اور اپنی محنت کا رائیگاں
نہ جانا یقین جانوں۔ چند روز بعد ایک عنایت نامہ اور پہنچا۔
گویا ساغر التفات کا دوسرا دور پہنچا۔ ۲

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۲۱
۲ ص ۳۵۷

یہاں خط کی مکرر آمد کو ساغر التفات کے دو دسرے دور سے تعبیر کرتے ہوئے ایک برمحل تشبیہہ وجود میں آئی ہے جس کو غالب جیسا بادۂ گلفام کا پرستار ہی اختراع کر سکتا تھا۔ پوری عبارت سے ایک خاص قسم کے سکون اور طمانیت کا اظہار ہوتا ہے اور اس کیفیت کو ساغر التفات کے استعمال نے نکھار دیا ہے۔

شفق ہی کے نام ایک دوسری تحریر سے یہ تشبیہہ بھی لائق توجہ ہے۔

یہ دن مجھ پر بہت گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پینے والے جانوروں کا۔ خصوصاً اس میں کہ غم و ہم کا وجود ہے۔ ۱

پیاسے حیوانوں کی حالت زار سے اپنی کیفیت کی تشبیہہ بھی جان دار ہے اور اس حقیقت نے کہ زبان سے پینے والے جانوروں کو یہاں مشبہ بہ قرار دیا ہے مکتوب نگار کی موسم سے بیزاری اور نفرت کو پورے طور سے ابھارا ہے۔

خطوط کے بے تکلف ماحول میں مکتوب نگار تشبیہات وضع کرتے ہوئے کبھی کبھی مزاح سے بھی کام لیتا ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کی تصویر پا کر اسے اپنی جوانی اور رعنائی یاد آتی ہے، اور پھر بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کا تذکرہ وہ مہر کے نام خط میں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ ۲

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۷۰

۲ خطوط غالب مہر ص ۲۴۷

ننھے ننھے سفید بالوں کی چیونٹی کے انڈوں سے مشابہت مشاہدے پر مبنی ہے اور محاورے پر بھی۔ لیکن خط کے سیاق و سباق میں اس نے بیان کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ گھریلو زندگی سے حاصل کردہ ایک اور پُر مزاح تشبیہہ مرزا تفتہ کے نام خط میں اس طرح ملتی ہے۔

لاحول ولاقوۃ، کس ملعون نے بسبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور کی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار، میں نے تو بطریق تہ در دلیش بر جان درویش لکھا تھا، جیسے اچھی جورو اپنے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔ ۱

یہ تشبیہہ جہاں خانگی زندگی کے مشاہدے اور شاید اپنے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے، وہیں مصنوعی ناراضگی اور فرضی بیچارگی کے ساتھ ساتھ مخاطب کے لئے پیار کا زیر لب اقرار بھی ملتا ہے۔ یہ مکتوب نگار کی شوخیٔ طبع اور بے تکلفی کی دلیل ہے۔ یہاں ہمیں یہ روایت بھی یاد آگئی ہے کہ غالب اپنی بیوی سے بیزاری کا اظہار کرتے رہتے تھے اور جھنجھلاہٹ میں انھیں موسیٰ کی بیٹی سے تعبیر کرتے تھے۔ حالانکہ متعدد خطوط میں جہاں بیگم کا تذکرہ ہے اس میں اپنائیت اور لحاظ کا احساس اجاگر ہے۔ ۲

مکتوب نگار علائی کے ایک استفسار کے جواب میں خسرا اور خسران کے الفاظ کی حقیقت واضح کرنے کے بعد یوسف علی خاں عزیز کے متعلق لکھتے ہیں۔

---

۱ خطوط غالب ۔ ۲ ص ۱۹۷

۲ حوالے کے لئے ملاحظہ فرمایئے خطوط بنام شہاب الدین احمد خاں، ص ۱۱۰، حکیم غلام نجف خاں ص ۳۷۵، ۳۷۷، حکیم ظہیر الدین احمد خاں ص ۳۸۳۔

یہ پرسش نہ بسبیلِ استہزا ہے۔ بلکہ یوسف علی خاں عزیز مانند اس
دہقان کے کہ جو دانہ ڈال کر مینہ کا منتظر ہو اور ابر آئے اور نہ برسے
مضطر و حیران ہے۔ علی حسین خاں آئے وہ آئے تو کیا لائے؟ ۱

یہ تشبیہ مشاہدے اور حقیقت پر مبنی ہے، جس کے ذریعہ یوسف علی خاں عزیز کی نادانی
اور معصومیت پر چوٹ کی گئی ہے۔

غالب نے قدر ملگرامی پر اپنی شاعرانہ کہنہ مشقی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تشبیہ
استعمال کی ہے۔

بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے
سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے
کی ورزش میں گذرے۔

نامۂ اعمال کا سیاہ ہونا محاورہ ہے۔ لیکن یہاں شومیٔ قسمت کا احساس بھی اس
سے پیوستہ ہے۔ اپنی ریاضت کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہونے کے احساس نے
گفتگو میں ایک عجیب تھکاوٹ کا لہجہ سمو دیا ہے۔ اس طرح کی تشبیہات آرائشی
نہیں ہوتیں بلکہ واردات جذبات کی تشریح اور توضیح کرتے ہوئے معنی اور تاثر
کی اساس بنتی ہیں۔ ایک دوسری مثال میر مہدی کے نام ایک خط سے پیش کی جاتی ہے۔
غدر کے بعد دلی کی بربادی اور مکانوں کے منتقمانہ انہدام کے تذکرے کو ان الفاظ
میں تمام کرتے ہیں۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جلتے رہے اور پانی گوہر
نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ ۲

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۸۷
۲ ص ۲۹۳

گوصحرا اور کربلا کی تشبیہ نئی نہیں ہے۔ تاہم پانی کا گوہر نایاب ہونا اور کنوؤں کا بند کیا جانا ماضی بعید، ماضی قریب اور مستقبل (ہو گیا تھا، ہو گیا ہے، ہو جائے گا) کے یکجا کر دینے سے تشبیہ میں نئی کسک پیدا ہو گئی ہے جو مکتوب نگار کے ذہنی کرب کی ترجمانی کرتی ہے۔

مکتوب نگار ہم چشموں کی زبان سے بے التفاتی اور ادب کی کم مائگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاضی عبدالجمیل جنوں کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

> میں کیا کروں فی الحال درد مان معانی کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلا جانتے نہیں، علما اعتنا نہیں کرتے، چھاپے کو توقیع الہیٰ سمجھتے ہیں۔ نسخۂ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے۔ کاپی نویسی کے جرم میں مصنف بیچارہ ماخوذ ہوتا ہے[1]

یہ ایک طویل توضیحی تشبیہ ہے۔ معنی کی بے مائگی کو غدر کے نتیجہ میں ملک کی بربادی سے تشبیہ دے کر اس زبوں حالی کی تشریح کی گئی ہے اور آخر جرم اور ماخوذ کے الفاظ نے لفظ غدر کی مناسبت کو فزوں تر کر دیا ہے۔ یہ تشبیہ اوزکمیل ہے اور مکتوب نگار کی علم دوستی کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور اور حقیقت بینی کی دلیل ہے۔ اسی توضیحی تشبیہ کا ایک اور بولتا ہوا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> اجی مرزا تفتہ، تم نے، دبیر سبھی کو اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبو دیا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلی کہ یہاں ہوتے ہوئے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر جوتی

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۵۲۲

لوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف . . . . . . ایک
معشوق خوبرو ہے۔ بدلباس ہے۔ ۱

اس اقتباس میں تشبیہ اندر تشبیہ ملفوف ہے۔ بنیادی تشبیہ تو سنبلستان کی کاپی اور بیگمات قلعہ کے مابین ہے۔ لیکن آگے چل کر خود بیگمات کو مہ کامل سے مماثلت دی ہے۔ اور دوبارہ اسی کاپی کو معشوق خوبرو کی مانند گردانا ہے۔ یہ تشبیہ ندرت آمیز اور معنی خیز ہے۔ بنیادی تشبیہ ہم عصر سماجی حقیقت پر مبنی ہے۔ اردو ادب میں ایسی مثالیں کم ہیں جہاں تشبیہ اتنی گیرائی کے ساتھ سماجی حقیقت سے پیوستہ ہو۔

تشبیہ اور استعارے نثر میں بھی کام آتے ہیں۔ لیکن شاعری سے ان دونوں کا گہرا تعلق ہے۔ تشبیہ کے ضمن میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ فن کار پڑھنے والوں میں وہ کیفیت پیدا کرنے کے لئے جو اس کے ذہن میں ہے، تشبیہ اور استعارے سے کام لیتا ہے۔ پیچیدہ اور دقیق مضمون کے ابلاغ کے لئے تو اس کی ضرورت بیش از بیش ہو جاتی ہے۔ غالب نے رمز آفریں استعاروں کے فن کارانہ استعمال سے اپنی شاعری کو گراں قدر بنایا ہے۔ لیکن وہ شعری اور نثری اسالیب کے جداگانہ تقاضوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غزل اختصار اور ایجاز کی طالب ہے اس کے برعکس نثر کا اسلوب خیال کی وضاحت اور صراحت پر زور دیتا ہے اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ غالب لذتِ ملاقات کی خاطر اپنے خطوط میں سلسلۂ گفتگو کو دراز تر کرنے کے عادی ہیں۔ اسی لئے ہمیں ان کے یہاں استعارے کا استعمال محدود پیمانے پر نظر آتا ہے۔ البتہ غالب کے اس خاص وصف کو سمجھنا ضروری ہے کہ وہ استعارے کے محض اشارے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ بنیادی خیال اور استعارے سے ملحق مفاہیم اور اجزا کا اضافہ لازمی قرار دیتے ہیں۔ نواب امراؤ الدولہ شفق کے نام ایک خط کے (جس کا حوالہ پہلے بھی آچکا ہے)

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۳۶۴

یہ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

> نہ تم میری خبر لے سکتے ہو۔ نہ میں تمہاری مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ اللہ
> اللہ، دریا سارا تیر چکا ہوں۔ ساحل نزدیک ہے۔ دو ہاتھ لگے اور
> بیڑا پار ہے۔[1]

یہاں بنیادی استعارہ زندگی اور شناوری کا ہے، جس کو بعد کے مختصر جملوں میں ابھارا
گیا ہے۔ بظاہر یہ استعارہ عمومیت لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی الحاقی تفصیل (ساحل
کے نزدیک ہونا، بیڑا پار ہونا جس کا عام محاورے کے برعکس یہاں زندگی کے اختتام سے
مراد ہے) نے اس استعارے کو معنویت اور غیر معمولی اثر بخشا ہے۔ یہ مکتوب نگار
کی ذہنی کیفیت اور بسیط تجربے کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ ماضی کی مسلسل کشمکش،
اور تھکاوٹ اور موت کی آرزو اس استعارے کے ذریعہ یک لخت سامنے آجاتی
ہے۔

علائی کے نام ایک خط میں استعارے کی توضیح نے تمثیل کی صورت اختیار کر لی
ہے۔ فن کار کو لفظوں کے انتخاب کا گہرا شعور ہے۔ ایک سلسلۂ خیال کی توضیح کے لئے
اس نے جو الفاظ جمع کئے ہیں وہ معنوی تلازمے سے مربوط ہیں۔ اس خط میں بنیادی
استعارہ اسیری ہے جس کے ذریعہ سے مکتوب نگار اپنی سرگزشت اس طرح پیش
کرتا ہے۔

> ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے
> ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر
> سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۳۶۴

واسطے یہاں بھیج دیا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم ضائع ہوگئی۔ بے حیا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہونچا۔ کچھ دن کم دو مہینے رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔ [۱]

یہاں قید و بند کے بنیادی استعارے کی رعایت سے اوائل عمری کو حوالات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سن شعور کے بعد کی عمر کو حبس دوام ٹھہرایا ہے۔ بیوی بیڑی اور مقام رہائش زنداں، تخلیقی مشاغل زنداں کی مشقت قرار پائے ہیں۔ اسی رعایت سے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۶۲

رشتے کے پوتوں کی ذمہ داری ہتھکڑی اور سفر کلکتہ و رام پور کو قیدی کے فرار ہونے سے موسوم کیا ہے۔ پوری عبارت میں احساس کی صداقت اور جذبے کی شدت جھلکتی ہے۔ قید اور سزا کی تفصیلات حقیقت پر مبنی ہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تفصیلات مکتوب نگار کی اسیری سے متعلق ذاتی تجربے کی دین ہیں۔ اس استعارے نے مفہوم و معنی کی تمام دلالتوں کو مجمل الفاظ میں قید کر لیا ہے۔

خطوط غالب سے قبل اردو ادبی نثر کا آغاز ملا وجہی کی تمثیل سب رس سے ہوتا ہے جو ۱۶۳۵ء میں عبداللہ قطب شاہ والئ گول کنڈہ کے عہد میں لکھی گئی۔ سب رس کو اردو نثر کا صحیفۂ اول قرار دیا گیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اردو نثر میں ہمیں مرزا محمد رفیع سودا کا ایک مختصر دیباچہ ملتا ہے جو انھوں نے اپنے دیوان مرثیہ کے آغاز میں لکھا ہے۔ اگرچہ سودا کی اردو نثر کا یہ نمونہ فارسی نثر سے بہت کچھ قریب ہے۔ تاہم اس دور میں یہ کوشش اس حقیقت حال کو واضح کرتی ہے کہ فن کار فارسی کے بجائے اس زبان میں اظہار خیال کی راہ استوار کرنے کا خواہشمند ہے جو اس کی شعر گوئی کا ذریعۂ اظہار ہے۔ میر عطا حسین خاں تحسین نے نوطرز مرصع کے عنوان سے ایک داستان لکھی۔ نوطرز مرصع فارسی انشا پردازی کے اس اسلوب سے متاثر ہے جس میں شاعرانہ وسائل سے کام لینا ہنرمندی کی دلیل تھی اور انشا پرداز کی نظر خیال کے ابلاغ کے بجائے اسلوب کی سجاوٹ پر مرکوز رہتی ہے۔

سلیس اور سادہ نثر کی ابتدا کے ضمن میں فورٹ ولیم کالج نے اہم خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر جان ولیم گلکرسٹ کی زیر نگرانی ہندوستانی ادب کے تراجم کے لئے کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں منشیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قدیم وضع کے یہ لوگ نثر میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس اس کالج کے نمائندہ ادیب ہیں۔ ۱۸۰۱ء

میں میرامن نے تحسین کی مقفیٰ اور مسجع عبارت کو ترک کر کے اسے ہندوستانی روز مرہ کے قالب میں ڈھالا۔ باغ و بہار کے دیباچے میں وہ گلکرسٹ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں ترجمہ کرنے کا حکم ملا تھا" موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرے"
فورٹ ولیم کالج اردو کا پہلا علمی اور ادبی ادارہ ہے جہاں مقصد کے تحت نثر نگاری میں وسیع پیمانے پر کام ہوا۔ لیکن ان تراجم کا مقصد زبان دانی تھا اس لئے یہ کارنامے اپنے ادیبوں کی شخصیت، تجربات اور عہد کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہے۔

فورٹ ولیم کالج کے دائرۂ اثر سے باہر لکھنؤ اور دلی میں ادبی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں انشاء اللہ خاں انشا نے ایک داستان کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی لکھی۔ انشا کی جدت پسندی نے یہ اہتمام کیا کہ قصے میں سنسکرت، عربی، فارسی یا دیہاتی بولی کے الفاظ نہ آنے پائیں۔ نیز اس کی زبان اونچے طبقے کے روزمرہ سے بھی مختلف نہ ہو۔ ان کی دوسری تصنیف دریائے لطافت کا درجہ اردو نثر اور اس کے اسالیب بیان کے ارتقا میں اہم ہے۔

ان انفرادی کاوشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی اظہار خیال کے لئے فارسی کے بجائے اردو نثر کو بطور وسیلہ استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم رنگین عبارت آرائی کا شوق دلی اور لکھنؤ میں بدستور مقبول خاص و عام تھا۔ جس کا ثبوت مرزا رجب علی بیگ سرور کی مرصع کاری کا مشہور کارنامہ فسانۂ عجائب ہے جو ۱۸۲۴ء میں وجود میں آیا۔ مصنف اس لکھنؤ کی ادبی زبان استعمال کرتا ہے جہاں تکلفات اور آرائش تہذیبی قدر کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ غالب کے ہم عصروں میں خواجہ غلام امام شہید کی نثر پر تکلف انداز کی شاہکار ہے۔ شہید کا مضمون "روضۂ تاج گنج"،

صفت نویسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ خواجہ غلام غوث بیخبر شہید کے مقابلے میں سادگی پسند ہیں جس کا اظہار "صبح" "دوپہر" اور "شام" کے نقشوں میں ہوتا ہے۔

غالب کے تخلیقی ذہن نے فارسی کے بجائے اردو نثر کی طرف متوجہ ہو کر اس میں نئے امکانات پیدا کئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں:

> مرزا غالب کو نثر کے تقاضوں کا پورا احساس اور اس سلسلے میں اپنے فرائض سے کماحقہ واقفیت تھی۔ ان کے خطوط کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ لیکن انھوں نے ہر موقع پر اظہار اور بیان کی جدا جدا مقتضیات کا خیال رکھا ہے۔ عام معلومات اور کاروباری باتوں کے علاوہ (جن کا خطوط میں ہونا قدرتی امر ہے) ان کے مکاتیب میں، واقعات کا بیان، اشیاء، اشخاص، مناظر، حالتوں کا وصف، تنقید و تقریظ اور فرائض موجود ہیں۔ مرزا نے ان میں سے ہر نوع کی پاسداری کی ہے۔[۱]

نفس مضمون اور سیاق و سباق کے لحاظ سے خطوط کے اسلوب، کو تین انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بیانیہ، توضیحی اور استدلالی۔ زندگی کے بیشتر شعبوں میں اظہار خیال اور بیان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور خطوط تو بالخصوص اسی طرز کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مکتوب نگار ان میں دل کی باتیں بیان کرتا ہے یا اپنی اور مکتوب الیہ کی مشترک دلچسپیوں سے متعلق گفتگو کا سلسلہ چھیڑتا ہے۔ غالب کے عہد کی اردو نثر نویسی کا ہم اوپر جائزہ لے چکے ہیں۔ فن کار کا ذہن مقصد اور غایت کے اعتبار سے اظہار خیال کے لئے منفرد پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔ منشی ہر گوپال تفتہ کے

---

۱ اطراف غالب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۷۵

کے نام سب سے پہلے خط میں ہمیں شاعری کے علاوہ نثری اسلوب کے متعلق جستہ جستہ جملے ملتے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اپنے کلام پر غالب کی تقریظ سے بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں مکتوب نگار لکھتا ہے۔

کیا کروں؟ اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کم تر۔ نثر کا بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش جان کوب بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے۔ اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔

اسی خط میں آگے چل کر یہ جملہ بھی ملتا ہے۔

جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔ [1]

یہاں مکتوب نگار ادبی امور کے سیاق و سباق میں اپنے تنقیدی موقف کی وضاحت کرتا ہے جس کی تہہ میں حقیقت پسندی اور توازن کا احساس کارفرما ہے۔ بنیادی طور پر غالب نے اس وصف کو اپنی نثر میں اپنایا ہے جس کی بدولت ان کا بیان حقیقت کے سانچے میں ڈھل کر اثر آفرینی سے معمور ہو جاتا ہے اس قبیل کی بیشتر مثالیں دی جا

---

۱ خطوط غالب۔ مہر ص ۲۰۰

بھی ہیں۔ یہاں سرسری طور سے چند اشارے کافی ہیں۔ مثلاً انوار الدولہ شفق کے نام ۱۸۶۰ء کا وہ خط جس میں دن کے بارہ بجے پلنگ پر لیٹے ہوئے حقہ پینے اور خط آنے کا تذکرہ ہے۔ بالخصوص وہ عبارت جہاں پانچ لشکروں کے پے درپے حملوں کی وضاحت ملتی ہے۔ مزید برآں متعدد خطوط میں برسات کے ضمن میں فقدانِ راحت کا حال اور دلی کی ویرانی اور بربادی کا احوال غالب کی بیانیہ نثر کے پرتاثیر نمونے ہیں۔ صرف ایک مثال علائی کے نام ۲/ اگست ۱۸۶۲ء کے خط کے آخری حصہ سے دی جاتی ہے۔

مینہ کھل گیا ہے۔ مکان مالکوں کی طرف سے مرمت شروع ہوگئی ہے۔ نہ ابر کا ڈر رہا ہے۔ نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا۔ ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔ [1]

عام واقعات اور تجربات سے قطع نظر جب کسی گہری حقیقت یا معنی کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو بیانیہ اسلوب توضیحی انداز میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب بعض امور کے اسباب کی نشاندہی اور توضیح کرنا ضروری ہوجاتی ہے۔ سائنٹیفک ذہن اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ توضیحی اسلوب کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ نجی خطوط میں اس کے امکانات محدود ہیں۔ تاہم غالب کے ذہن کی تشکیل میں علم، تعقل اور جذبے کے عناصر شامل ہیں۔ ایسی شخصیت کے نجی خطوط اپنی دنیا کو وسیع تر کرنے اور توضیح مطالب کے لئے ہمہ وقت

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۸۲

تیار رہتے ہیں۔ تفتہ اور جنون کے نام بعض خطوط میں اصلاح شعر کے سلسلے میں یہ انداز نمایاں ہے۔ تفتہ ہی کے نام ایک خط میں زبان اور صنعت کے سلسلے میں بعض وضاحتیں اس طرز کا دلچسپ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھئے۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو خطاب بہادری کہنا بہت بیجا ہے۔ سو اخطاب کے مراتب میں پہلے تو خانی کا خطاب ہے۔ اور یہ بہت ضعیف ہے۔ اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے میر محمد علی یا شیخ محمد علی یا محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی خانی ہے حاصل، پس جب اس کو بادشاہ وقت محمد علی خاں کہہ دے تو گویا اس کو خانی کا خطاب ملا۔ اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی محمد علی خاں یا تو وہ قوم افغان سے ہے یا خانی اس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو محمد علی خاں بہادر کہا۔ پس یہ خطاب بہادری کا ہے۔ اس کو بہادری خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب دو لگی کا ہے یعنی مثلاً محمد علی خاں بہادر اس کو "نصیر الدولہ محمد علی خاں بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "دولگی" کا ہوا۔ اس کو بہادری کا خطاب نہیں کہتے۔ اب اس خطاب پر افزائش "جنگ" کی ہوتی ہے۔ "نصیر الدولہ محمد علی خاں بہادر شوکت جنگ" ابھی خطاب پورا نہیں۔ پورا جب ہوگا کہ جب "ملک" بھی ہو۔ پس پورے خطاب کو "خطاب بہادری" لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔[1]

---

[1] خطوطِ غالب مہر ص ۱۲۱-۱۲۲

اس خط میں عام فہم سادہ زبان میں مثالوں کے ذریعہ منصب اور خطاب کی باریکیوں پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے، وہ نثر کے توضیحی اسلوب کی بولتی ہوئی مثال ہے۔

اسی طرح قاضی عبدالجمیل جنون کے نام خط میں فارسی ترکیبوں اور فقروں کے ضمن میں مندرجہ ذیل تحریر توجہ طلب ہے۔

میاں قدرت اللہ صاحب کا تردد بیجا۔ پیش از صبح صادق نماز کیسی؟ یہ کاتب اول کی خوبی اور نقل کرنے والوں کی غفلت ہے۔ اصل فقرہ یوں ہے۔ خود بدولت پیش از صبح صادق برخاستہ بعد بانگ صلوٰۃ باجماعت

فضلا نماز ادا کردہ، بہ جھروکۂ درشن تشریف می آوردند۔

حضرات نے بنفس نفیس بڑھا دیا اور برخاستہ کو بیکار اٹکا دیا۔ صبح صادق پہلے یعنی دو تین گھڑی رات رہے اٹھتے اور ضروریات سے فراغت کرتے۔ وضو کے مراسم بجا لاتے۔ جب مؤذن اذان دیتا جماعت کی نماز پڑھتے۔ رفع حوائج ضروری کو "برخاستہ" کے بعد مقدر چھوڑ جانا بلاغت ہے۔ یعنی اس وقت کے افعال بول و براز ہیں۔ ان کا ذکر مکروہ طبع ہے عموماً اور بہ نسبت پادشاہ [illegible] کے ادب ہے خصوصاً اور یہ جو فقرہ بنفس نفیس کو غلط کہتا ہے۔ یہاں ایک دقیقہ ہے۔ یعنی بہت کام ایسے ہیں کہ آدمی آپ بھی کر سکتا ہے اور خادم سے بھی لے سکتا ہے۔ مثلاً چلم پر آگ دھرنا یا پاخانے میں لوٹا لے جانا۔ اور بہت کام ایسے ہیں کہ ہر شخص کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا نیابتاً نہیں کر سکتا۔ مثلاً حقہ پینا، پاخانہ جانا، سونا، جاگنا، اٹھنا بیٹھنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ پس افعال مشترکہ میں بنفس نفیس لکھ سکتے ہیں اور

افعال مخصوصہ میں بھی نفیس نفیس کی قدر لغو اور پیچ اور سہل ہے۔ ۱
یہاں ایک مشکل ترکیب کو جس طرح سہل بنا کر روزمرہ زندگی سے مثالیں دیکر واضح کیا ہے۔ وہ وضاحت اور سلاست کی کامیاب ترین کوشش ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ غالب کی مشکل پسندی نثر میں کس طرح آسان شالوں کی مدد سے توضیح مطالب سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ جنون کے نام ایک دوسرے خط (مورخہ ۲۴ راگست ۱۸۶۳ء) میں غالب نے اپنے چند اشعار کی تشریح کی ہے۔ جن میں سے حسب ذیل تشریحات و توضیحات لائق مطالعہ ہیں۔

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

معنی کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

"مولوی صاحب، کیا لطیف معنی ہیں واہ وہ نیا حُسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اس کو بہ نسبت سے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا، اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اور حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ بوالہوس آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان میں آئے تو حقیقت کھل جاتی۔ ۲

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۵۲۲

۲ ص ۵۲۴

مکتوب نگار نے شارح کی حیثیت سے معانیٔ مطلوب کو آسان فہم اور مجمل انداز سے گوش گزار کیا ہے، دوسرے شعر کی تشریح نسبتاً تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی۔ مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہوجائے۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا۔ اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر دالہ وشیفتہ ہوگیا۔ کیسا خط کیسا جواب، دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ، جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر؟ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں۔ لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کا کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟[1]

شعر میں الفاظ کے در بست کے ذریعہ جو خیاں آفرینی عمل میں آئی ہے۔ مکتوب نگار گفتگو کی بے تکلف زبان میں اس کی جس بھرپور انداز میں توضیح کرتا ہے وہ نثر میں سہل ممتنع کہی جاسکتی ہے۔

غالب میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں مندرجہ ذیل شعر تحریر کرتے ہیں

---

1 خطوط غالب مہر ص ۳۲۵۔

ہستی ہماری اپنا فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

اس کی تشریح طویل ہے جس میں سے چند جملے پیش کیے جاتے ہیں۔

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا بڑا ہے۔ کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیت میں سے نہیں ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو تو ہے دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے۔ ۱

اسی خط میں بعض صنائع، ٹکسالی زبان اور تذکیر و تانیث کے اصولوں سے بھی مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے۔ جسے طوالت کے خوف سے یہاں حذف کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور سے یہ خط تشریح و توضیح کی کامیاب مثال ہے۔

انور الدولہ شفق نے غالب سے دُم دار ستارے کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ اجرام فلکی کے معاملاتِ دنیا پر اثر انداز ہونے کی جس طرح وضاحت کرتے ہیں اس سے ان کی قدرتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب منشی ہرگوپال تفتہ سے اپنے مشرب اور انسان دوستی کے مسلک کی وضاحت جس انداز سے کرتے ہیں وہ ان کی وسعتِ قلب کی روشن دلیل ہونے کے علاوہ توضیحی نثر کا ایک دل آویز نمونہ ہے۔

جنود پرور میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔ اور

---

۱ خطوط غالب - مہر ص ۳۰۹

اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری
جس کو دنیا والے قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور
طریق شرط ہے۔ اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور
پر اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے جس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔
ازراہ حسن و اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے؟ ۱

تحریر و تقریر میں وزن پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی استدلالی شکل دی جاتی ہے جس کے لئے منطق اور دلیل کی شمولیت ناگزیر ہے۔ غالب کے متعدد خطوط میں اس استدلالی اور منطقی طرز کی جھلک نمایاں ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے اس شکوے کے جواب میں کہ مکتوب نگار نے ان کو جواب دینے میں تاخیر برتی مدلل انداز میں گویا ہوتے ہیں۔

بندہ پرور،
فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے
کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے
اور مبنی بر راستی کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا میں
یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا۔ اس
واسطے آپ کو خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس
عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ الٹے پھر آئے۔ اب شکوہ کا ہے کو
کہنے میں۔ اپنا گناہ مجھ پر دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ
میں کہاں جاتا ہوں۔ نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۱۷۹

مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہیے اپنے دعویٰ میں
صادق ہوں یا نہیں۔ بس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ ۱

مکتوب نگار نے اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کی مضبوط دلیلوں نے مخاطب کو لاجواب کر دیا ہے۔ مگر اس استدلالی انداز کا خاتمہ خود محبت آمیز گلہ پر ہوتا ہے کہ مخاطب نے شکوہ و شکایت سے کام لے کر ایک صادق دوست کے زخم پر نمک چھڑکا ہے۔ مرزا علاء الدین خاں علائی کے نام ۲ اپریل ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں بھی یہ منطقی اور مدلل انداز بیان نمایاں ہے۔ اس میں علائی کے فرزند کی تاریخ ولادت نہ لکھنے کی استدلالی انداز میں معذرت کی ہے۔

اس نوع کے خطوط میں اکثر و بیشتر غالب کا دستور یہ ہے کہ وہ مخصوص مطلب ادا کرنے کی خاطر پہلے ایک کلیہ بیان کرتے ہیں اور پھر اسے اپنے موضوع پر منطبق کر کے خاطر خواہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ علائی کے نام محولہ بالاخط میں خود داری کو ٹھیس پہنچنے پر برہمی کا اظہار ملتا ہے کہ غالب کے مشہور و معروف ہونے کے باوجود، علائی ان سے ان کا پتہ دریافت کریں۔ اس کا جواب جو لکھتے ہیں۔

سنو صاحب، جس پرستوں کا ایک قاعدہ ہے وہ امراء کو دو چار
روپے انعام دیتے ہیں۔ [illegible] جانتے ہیں کہ [illegible] لیکن یہ سمجھے ہیں
یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص جس کو
اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے
اور صاحب، تم بھی جانتے ہو [illegible] تم اس سے قطع نظر کرو اور
اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ ۲

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۲۱۱
۲ ص ۵۸

علائی کے نام ایک معروف خط کا آغاز بھی ایک کلیے کے اظہار سے ہوا ہے اور پھر اسی بنیادی مفروضے پر پورے خط کا مرکزی خیال قائم کیا گیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ [1]

یہاں ایک مفروضے کے بعد دوسرا مفروضہ قائم کر کے خط کے مضمون کو ایک طرح کی منطقی اور استدلالی شکل دی گئی ہے۔

بنیادی طور پر یہ مطالعہ غالب کے خطوط کے فنی تجزیے پر مبنی ہے۔ لیکن جب فن گفتگو کا عنوان بنتا ہے تو فن کار کی شخصیت کا ذکر درمیان میں آنا ناگزیر ہے۔ فن کار اپنی تخلیق سے پہچانا جاتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کا رنگ اور خوشبو شامل ہوتی ہے۔ خطوط غالب میں ہم ایک فرد کی نجی زندگی کے شب و روز کی تصاویر بکھری ہوئی پاتے ہیں۔ یہ تصویریں انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ مکتوب نگار اپنی ذات پر سے دبیز پردے اٹھاتا ہے تو ہم ایک ایسی شخصیت کو اپنے روبرو پاتے ہیں جو ایک طرف اپنے کردار کی بلندی تو دوسری طرف بشری کمزوریوں کی بدولت جیتی جاگتی اور گوشت پوست کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالب کے یہ خطوط ان کی زندگی کے آخری دور (۱۸۴۸ء تا ۱۸۶۹ء) کی یادگار ہیں۔ مجموعی طور سے

---

۱ خطوط غالب مہر ص ۶۱

ان میں جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی ہے جو خود کو آدم دارم آدم زادم کہہ کر اپنی انسانی سرشت کا اعلان کرتا ہے۔ یہ ایک ہمہ رنگ شخصیت ہے جس کے جذبے کی آنچ اور ذہن کی روشنی الفاظ میں منعکس ہو کر اپنے ذاتی تجربوں، اور عصری احوال کو بیان کرکے مخاطب کو ذہنی رفاقت سے دوچار کرتی ہے۔

غالب نے جاگیردارانہ نظام کے زیر سایہ پرورش پائی۔ طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کے اندر وہ خصوصیات سرائیت کیے ہوئے تھیں جو اس طبقے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی کا آغاز اس خاندانی تفاخر سے شروع ہوتا ہے۔ یہی چیز ان کی انانیت کو ہوا دیتی ہے اور تخلیقی ادب میں انفرادیت بن کر ابھرتی ہے۔ اس خصوصیت نے جہاں ان کے اندر خود اعتمادی کو جنم دیا وہاں زمانے کی ناقدر شناسی کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب کے رجائی انداز فکر نے قدردانی کے ساتھ محرومی اور ناانصافی کو بھی اپنے لیے گوارہ بنایا ہے۔ غالب کی ہمہ رنگی ان کے خطوط میں بکھری ہوئی ہے۔ دھوپ اور چھاؤں کا تضاد جس طرح زندگی کی حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتا ہے وہ مخاطب کو جمالیاتی تاثر سے دوچار کرتا ہے۔

غالب مجلسی زندگی کے شائق ہیں۔ ان کے لیے خطوط محفل آرائی کا ذریعہ بنتے ہیں جس کی صدرنشینی بلا شرکت غیرے ان کے حصے میں آئی ہے۔ خط میں وہ ایک ایسے ماحول کی تخلیق کرتے ہیں جہاں دو انسانوں کو لطف صحبت بہم ہو سکے انھیں مکتوب نگار پر اعتماد ہے۔ وہ حالات کے نشیب و فراز سے گذر کر پختگی کی اس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں ان کی مجموعی شخصیت خاص وضع میں ڈھل گئی ہے۔ چنانچہ اپنے خطوط میں وہ جس قسم کی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اس میں اپنائیت کے ساتھ ساتھ دانش و بینش کا ایک مخصوص آہنگ شامل ہے جو مکتوب نگار

کی شخصیت کے وزن اور وقار کو ثابت کرتا ہے۔ غالب کا دل اپنے شاگردوں اور دوستوں کے لیے محبت اور شفقت کے جذبات سے لبریز ہے۔ علائی، تفتہ، میر مہدی، یوسف مرزا، منشی شیو نرائن آرام، انوار الدولہ شفق، مہر اور حقیر وغیرہ کے نام خطوط میں مختلف امور موضوع گفتگو بنتے ہیں۔ غالب ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے خطوط میں نجی زندگی کے جن پہلوؤں کو بلا کم و کاست بیان کیا ہے وہ ان کی راست گوئی کا ثبوت ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں:

ان کے خطوط میں ہمیں فن کاری کی وہ جرأت اور صداقت ملتی ہے جو اپنے سینے سے ہر حجاب کو اتارنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ جو یسی ہی نظر آنا چاہتی ہے جیسی وہ ہے۔ [۱]

وہ باحث و زندقہ کو مردود، شراب کو حرام اور خود کو عاصی سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مے نوشی کے شغل کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ صوم و صلوٰۃ سے بے نیازی اور بیگانگی کا شرمندگی سے اظہار کرتے ہیں۔ درمعلوک الحالی اور تنگدستی کی پوشش کو راز میں رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ غالب کی شخصیت اپنے عہد کے حالات و واقعات سے متاثر ہوتی ہے مخاطب کو بھی اپنا شریک حال بنانے میں آسودگی محسوس کرتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر ایک قومی سانحہ تھا جس کے دردو الم واقعات غالب کے خطوط میں درد کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں مکتوب نگار کا شہر دلی سے جذباتی لگاؤ ہے۔ یہاں کے اشخاص، گلیاں، سڑکیں اور عمارتیں ان کے لیے خاص مفہوم کی حامل ہیں۔ اس شہر کو فوجی چھاؤنی (کیمپ) میں تبدیل ہوتے

۱؎ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین۔ غالب اور جدید ذہن۔ پروفیسر آل احمد سرور۔

دیکھ کر اُسے دھکا پہنچتا ہے۔ غنیار کے ازواج و اولاد بھیک کے لئے دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ قلعہ، چاندنی چوک، جامع مسجد کا مجمع، جمنا کے پل کی سیر، پھول والوں کے میلے کی رونقیں گم ہوگئی ہیں۔ جن کے بغیر دلی دلی مرحوم بن گئی ہے۔ (بنام میر مہدی مجروح) غالب انوارالدولہ شفق اور میر مہدی مجروح کے خطوط میں اس قتل عام کا ماتم کرتے ہیں جس میں دلی کی نامی گرامی شخصیتیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ انگریز قوم کے ان معصوم افراد کی موت پر اظہار غم کرتے ہیں جو باغیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس سے مکتوب نگار کی وسیع المشربی اور انسان دوستی کا احساس واضح ہوتا ہے۔

غالب کی خوش ذوقی اور ذہانت کی بدولت جو شوخی اور ظرافت ان کے خطوط میں ابھرتی ہے اس کا سرچشمہ زندگی کے متنوع تجربات ہیں جو ان کی ظرافت کو معنی بناتے ہیں۔ وہ دوستوں کے محبت بھری چٹکیاں لے کر مخاطب کو دو گھڑی ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی ظرافت جنت، دوزخ، حور، بیوی، دوستوں اور کبھی کبھی خود کو ہدف بنا کر شوخیٔ بیان کا جوہر دکھاتی ہے۔ کبھی ظرافت میں طنز کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن اس طنز میں زہرناکی اور تنقیص نہیں ہوتی۔ طبیعت کی شگفتگی بڑے بوڑھوں کو سرد چراغاں سے تعبیر کرتی ہے اور ماہ رمضان میں صوم وصلوٰۃ کے فرضی مشاغل کی تفصیل بیان کرکے ظرافت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ کبھی مکتوب نگار نفسیاتی تحفظ کے لئے خود استہزائی کا انداز اپناتا ہے اور اپنے نفس اور غیر نفس کو بالمقابل کھڑا کرکے غیر نفس سے ذلت آمیز کلمات ادا کرتا ہے اور اپنی ذلت پر ایک تماشائی کی حیثیت سے خوش ہوتا ہے۔

غالب کی ہمہ رنگ شخصیت کا ایک دلپذیر انداز ان کی خودداری ہے جس کی جھلک ہمیں ان کے عہدِ جوانی میں نسبتاً صاف دکھائی دیتی ہے۔ ۱۸۲۶ء میں دو قیام لکھنؤ

کے دوران نائب السلطنت معتمد الدولہ سے کھڑے ہو کر اپنی پذیرائی اور معانقہ کرنے کی توقع رکھتے ہیں جو منظور نہیں ہوتی۔ چنانچہ ملاقات بھی ملتوی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ۱۸۴۰ء میں دلی کالج کی مدرسی کے سلسلے میں جیمس ٹامسن سے دروازے پر استقبال کی توقع غالب کی عزت نفس کی نشان دہی کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف جب یہ عزت نفس احتیاجات کے ہاتھوں مات کھاتی ہے تو وہ دوستوں کی کوشش سے بہادر شاہ ظفر کے دربار سے منسلک ہو جاتے ہیں اور ششماہی تنخواہ کو ماہانہ میں تبدیل کرنے کی غرض سے اس قسم کے اشعار کہنے میں عار نہیں سمجھتے۔ آپ کا بندہ اور پھروں ننگا، آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار۔ اس سے کہیں زیادہ غالب کی خودداری نواب رام پور کے حضور میں سرنگوں ہوتی ہے۔ بالخصوص عمر کے آخری ایام میں جب آمدنی محدود اور اخراجات کا دائرہ وسیع تر ہے۔ وہ نواب کلب علی خاں کے حضور میں بار بار مزید امداد کے لئے گڑگڑاتے ہوئے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔

غالب کی خودداری اور عاجزی کے ان دو متضاد رویوں سے متعلق قطعی فیصلہ کرنے سے قبل ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ نوابین اور امرا کی قصیدہ گوئی اور ان سے مالی امداد کی اُمید کو غیر اخلاقی اقدام سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ شخصی حکومت اور جاگیردارانہ نظام کے اس ڈھانچے میں جو تہذیبی آداب اور قوانین صدیوں سے مروج تھے اس کی رو سے شاعر کی اپنے ممدوح سے داد و دہش کے حصول کی خواہش اس کا جائز حق تھا۔ غالب نے اپنے عہد کے دستور کے مطابق نوابوں، امیروں اور انگریز افسران کی شان میں قصیدے فراوانی سے لکھے کیونکہ زندگی کی ضروریات شاعر کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ صاحبانِ ذی شان کی خدمت میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے ممدوح سے حوصلہ افزائی کے بقول ظ۔ انصاری:

ان کی غرض محض تعریف یا خوشامد نہ تھی۔ بلکہ اپنا امیرانہ اور شاعرانہ
حق طلب کرنے یا وصول کرنے کا ایک رسمی بہانہ تھا۔ ۱

اپنی قصیدہ گوئی کے بارے میں غالب دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے یہاں مدح کے
شعر کم ہیں اور تشبیب کے زیادہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب انھیں ممدوح کی
طرف سے ناامیدی ہوتی ہے تو وہ اسی قصیدے کے چند الفاظ تبدیل کر کے دوسری
جگہ پیش کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک امیروں کی قصیدہ
گوئی محض شاعرانہ رسم ہے۔ جس سے ممدوح کے نام کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں
نہیں ہوتا اور جس کا صلہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کے اعتراف کی صورت میں
ملنا چاہئے۔ چنانچہ وہ بے جھجک کہتے ہیں کہ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا۔
خلعت موقوف ابھٹی متروک (بنام علاء الدین احمد خاں)

غالب کی مصلحت بینی کا اندازہ ان کی تصنیف دستنبو سے ہوتا ہے جو غدر کے
زمانے کے واقعات پر مبنی ہے جسے انھوں نے عجلت کے ساتھ نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپوا کر
طلائی جلد کے دیدہ زیب نسخے انگریز افسروں کے پاس اس خیال سے بھیجے کہ حالات
ٹھیک ہوتے ہی پنشن اور دربار کی مراعات جاری ہو جائیں گی۔ ان کی مصلحت پسندی
اور صلح جوئی کے نقوش خط میں جا بجا ابھرتے ہیں۔ کوشش کے باوجود غالب تین
سال تک نئی حکومت کی نظر میں مشکوک رہے۔ غدر کے دوران وفاداری کا کوئی
مظاہرہ ان سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ علاوہ بریں مخبر کی غلط اطلاع پر فتح دلی کے
موقعہ پر بہادر شاہ ظفر کے لئے سکہ کہنے کا الزام مزید پریشانی کا موجب بن گیا
تھا۔ انھوں نے انگریز حکومت کے سربراہوں سے رابطہ پیدا کرنے اور اپنی

---

۱ ظ۔ انصاری: غالب شناسی ص ۳۰۲

بے گناہی ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ۔ جب وہ چیف سیکرٹر صاحب سے ملنے پہونچے تو انھیں باریابی کی اجازت نہیں ملی جس پر وہ آزردگی محسوس کرتے ہیں ۔ بالآخر کچھ عرصہ بعد لفٹیننٹ صاحب کے دربار میں شرکت کی عزت افزائی کی اطلاع دیتے ہوئے وہ باغ باغ نظر آتے ہیں ۔ اسی طرح آرنلڈ صاحب سے گفتگو کا شرف ان کے لئے ناقابل بیان خوشی کا موجب بنتا ہے ۔ یہاں غالب کی خود داری مصلحت اندیشی کے بوجھ تلے دب جاتی ہے ۔ یہ مصلحت بھی زمانے کا تقاضہ ہے جس پر ان کی گرفت نہیں ہے ۔

غالب کی مصلحت اندیشی کے مقابلے میں ان کی انانیت پر نظر ڈالئے تو یہاں ایک بے اعتماد شخصیت کا احساس برتری واضح طور پر محسوس ہوتا ہے ۔ یہاں توجہ کا مرکز بیرونی دنیا کے بجائے شاعر کے اپنے علم وفضل کی جولان گاہ ہے ۔ انھیں اپنی فارسی دانی پر غیر معمولی اصرار ہے اور وہ وثوق سے کہتے ہیں کہ فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر ۔ وہ فارسی دانی میں اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے ۔ فیضی کے بھی وہ کسی قدر قائل ہیں ۔ ہندوستان کے جن فارسی شعرا اور لغت نویسوں کو معتبر مانا جاتا تھا ۔ انھوں نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے شاعری میں ان کے معیار کا اندازہ خطوط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔ وہ تفتہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ کر اس کے قوافی پر لفظ جوڑنے سے شعر نہیں کہے جاتے کیونکہ شاعری معنی آفرینی ہے ، قافیہ پیمائی نہیں ۔ پندرہ سے پچیس سال تک کی عمر تک مضامین خیالی لکھتے رہے ۔ دس برس تک ایک بڑا دیوان جمع ہو گیا ۔ لیکن جب اپنے تخلیقی شعور کی گہری کا احساس ہوا تو ان اوراق کو تلف کر دیا ۔

(بنام عبد الرزاق شاکر) اپنے اشعار کو جس طرح قلم زد کرنا شاعر کی سلامت روی کی دلیل ہے۔ خطوط میں ہمیں نقاد کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غالب کی انفرادیت ناقابلِ تردید ہے۔ شاعری کے محاسن و معائب سے متعلق جچی تلی رائیں اپنے دور کے بیدار مغز نقاد کی صلاحیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اشعار کی توضیح و تشریح، فن اور زبان کے مسائل پر گفتگو، شاعری کی فرسودہ روایات سے گریز اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں فن کار کو غور و فکر کی عادت ان تمام علمی اور ادبی پہلوؤں پر غالب اپنے خطوط میں زور دیتے ہیں۔

اردو زبان سے غالب کو خطوط کی حد تک دلچسپی پیدا ہوگئی تھی جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات بیان کر کے ایک جاندار اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ اس کے باوجود عجیب بات ہے کہ ان کے ذہن پر فارسی زبان کی برتری کا احساس بدستور برقرار رہا۔ وہ اردو کو اپنی ذہانت کے مزید مظاہرے کے لئے استعمال کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ لہذا جب ہنری اسٹورٹ ریڈ (ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم صوبہ متحدہ یوپی) نے ان سے اردو میں قصہ لکھنے کی فرمائش کی تو وہ اس زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود اپنی تخلیقی قوت کا مظاہرہ فوری طور پر نہیں کر سکے۔ وہ فن کی انتہا یہ سمجھتے ہیں کہ زور قلم صرف کر کے معانی نازک پیدا کئے جائیں۔ اور اسی لئے وہ اردو زبان میں عبارت آرائی کی گنجائش نہیں پاتے۔ ان کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل نہیں ہوتا کہ قصے کے لئے جس طرزِ بیان کی ضرورت ہے اس پر انھیں ماہرانہ عبور حاصل ہے لیکن وہ اس قسم کی سعی کو اپنے ادبی مقام سے فروتر خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "اردو کیا لکھوں؟ اردو میرا منصب ہے؟ دیکھیے! اردو کی فرمائش ہو۔" (بنام منشی شیو نرائن آرام) فارسی کی برتری اور اردو کے سہل الحصول ہونے کا تصور غالب کے ذہن پر برابر مسلط

رہتا ہے۔ چنانچہ جب فارسی کے دلدادہ حضرات ان سے فارسی تحریر کی فرمائش کرتے ہیں تو وہ اُن سے اپنی تحریرات روزمرہ اردوئے سادہ و سرسری "کو غنیمت جان کر قبول کرنے کی استدعا کرتے ہیں (بنام عبدالرزاق شاکر)

غالب نے صاف گوئی سے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کیا ہے۔ وہ خدا کی وحدانیت اور نبوت پر ایمان لاتے ہیں۔ نبوت کے بعد وہ امام مرتضوی کو فضیلت دیتے ہیں اور بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ گو وہ صحابہ کرام کا احترام کرتے ہیں تاہم حضرت علی کو فوقیت کا درجہ دیتے ہیں اور انھیں امام من اللہ قرار دیتے ہیں۔

غالب مجروح کے نام ایک خط کے آخر میں کمال محبت سے لکھتے ہیں۔ "خدا کے بعد نبی، نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔ لیکن دوسری طرف خطوط میں وہ تصوف کے مسلک سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ "میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں" (بنام سرفراز حسین)۔ مجروح کو لکھتے ہیں۔ "صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوۂ صوفیا کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا" وہ ان عقائد کے اظہار میں تامل نہیں کرتے جو شیعیت کی نفی ہے۔ غالب نے مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے سے بیعت کی ہے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام خطوط سے مکتوب نگار کی روحانی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب جیسی شخصیت کسی ایک دائرے میں مقید نہیں رہ سکتی۔ سچ پوچھئے تو ان کی نظر میں مسلک اور مذہب کی قید بے معنی ہے۔ وہ انسانیت کو قدر اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ اور ہندو اور مسلمان کی تفریق سے بالاتر ہو کر انسان کو انسان ہی کے روپ میں دیکھنے کے قائل ہیں۔

خطوط سے ہم غالب کے جسمانی خدوخال کے بارے بھی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کی تصویر پہونچی ہے تو انھیں بے ساختہ اپنا عہد

شباب یاد آتا ہے۔ لانبا قد سرخ و سفید رنگ جو شراب نوشی کی وجہ سے بڑھاپے
جیسے رنگ میں تبدیل ہو گیا ہے غالب جوانی میں سر منڈاتے اور پٹے رکھتے تھے۔
ضعیفی میں جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تو ڈاڑھی منڈانا ترک کر دی۔
دلی والوں کا قاعدہ تھا کہ ڈاڑھی کے ساتھ سر پر بال بھی رکھتے تھے۔ لیکن غالب
نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے جس دن ڈاڑھی رکھی تو سر منڈھا دیا۔

غذا میں ہر صبح بادام کا شیرہ مصری کے شربت کے ساتھ پیتے تھے۔ گوشت
بہت پسند تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ تازہ اور بے ریشہ ہو
تاکہ بوٹی پکنے پر لذیذ رہے۔ جب تک صحت ٹھیک رہی دوپہر کے کھانے میں گوشت
کے علاوہ روٹی بھی ہوتی تھی۔ گوشت کی مقدار آدھ سیر ہوتی تھی۔ جب صحت
نے جواب دیدیا تو غالب نے روٹی اور چاول بھی چھوڑ دیے۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت
کی گاڑھی یخنی اور سر شام کبھی کبھی تین چار شامی کباب۔ پھلوں میں انگور آم پسند
تھے۔

غالب نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور کی بے راہ روی کا ذکر کیا ہے شراب
کی عادت اسی دور کی یادگار ہے۔ شروع میں دن میں بھی پیتے تھے اور رات کو
بھی۔ لیکن مضر اثرات کے خیال سے دن میں شراب پینی ترک کر دی۔ اور شام کو
بھی مقدار میں کمی کر دی۔ ابتدا میں روزانہ پاؤ بھر پیتے تھے۔ آخر زمانے میں
جب احتراق خون میں مبتلا رہنے لگے تو شراب کی مقدار چند تولے رہ گئی۔ شراب
کی تیزی کو دور کرنے کے لئے دو تین حصے گلاب ملاتے تھے۔ غالب ولایتی
شراب کے شوقین تھے۔ غدر میں ولایتی شراب کم بکنے لگی۔ انھیں اولڈ ٹام مرغوب
تھی۔ غدر میں ولایتی شراب کم ملنے لگی تو مہیش پرشاد (آنریری مجسٹریٹ دلی)
نے انھیں دیسی شراب تحفہ کے طور پر بھیجی۔

غالب کی شخصیت کی ہمہ گیر بوقلمونی اسلوب کی توانائی کا سرچشمہ بن کر قاری کے لئے لطف و انبساط حیرت و استعجاب اور ذہنی رفاقت کے جذبات ابھارتی ہے۔ الفاظ کے پس پردہ غالب کے ذہن کی روشنی تحریر کو نئی معنویت بخشتی ہے چنانچہ پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی غالب کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> غالب کے ذہن کی بلندی اور عظمت کو ان کی شخصیت کی وسعت اور رنگارنگی سے اور ان کے علم و فضل کو ان کے تخلیقی جوہر سے الگ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ان سب کی باہمی ترتیب و امتزاج اور ان کے کیمیاوی عمل سے غالب کے ادبی کردار کی تعمیر ہوتی ہے ان کی شخصیت سادہ اور اکہری نہیں پیچیدہ اور پہلودار ہے۔ وہ محض شاعر نہیں ایک تہذیب کا مظہر ہیں جو کئی تہذیبوں کے ٹکراؤ اور اختلاط سے وجود میں آئی تھی اور اس وقت صورت گری و صورت پذیری کے ایک نئے مرحلے سے دوچار تھی۔ غالب محض شاعر نہیں۔ ایک دور کی علامت ہیں۔ ایک ایسا دور جس میں اندھیرے اور اجالے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے اور پاس کی پرچھائیاں دور کی پرچھائیوں کو پے بہ پے کاٹ رہی تھیں۔ غالب کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس کشاکش سے انہوں نے اثر قبول کیا اور اس تضاد و تصادم کی فضا میں اپنے تخلیق کے شعلے کی پرورش کی۔ [1]

---

[1] پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی۔ مضامین نو۔ کچھ خطوط غالب کے بارے میں۔ ص ۱۰۹

غالب کا اسلوب اردو نثر میں ایک خاموش انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے اور خطوط اس طرزِ تحریر کے لازوال نمونے ہیں۔ ان خطوط سے قبل اردو نثر بیشتر پرتصنع اسلوب کی اسیر تھی۔ اور زندگی کے تمام تجربوں اور حقیقتوں کے اظہار کی اپنے اندر سکت نہیں رکھتی تھی ــــــــــــ۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت اور لفظی تزئین و آرائش کے اہتمام نے خیال اور معنی پر پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ لیکن غالب نے اپنے ہم عصروں کی روش سے الگ راہ نکالی اور نثر کو حقیقت پرستی سے آشنا کیا۔

خطوطِ غالب کی نثر سلیس اور پرتاثیر ہے۔ اظہار کی بے تکلفی اور مضمون کی بے ساختگی اس کی نمایاں صفات ہیں۔ یہ خطوط تحریر و تقریر کی زبان کو قریب لانے کی شعوری کاوش کے مظہر ہیں۔ جزئیات نگاری نے عبارت میں بعض اوقات مرقع کشی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ قوتِ بیان اور ڈرامائی ذہن نے تحریر کو حرکت، توانائی اور روانی بخشی ہے۔ غالب کی فطری ظرافت اور شوخی نے اسے جلا دی ہے اور اس کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے جس سے وہ جدید ذہن کے لئے زیادہ قابلِ قبول بن گئی ہے۔ گاہ گاہ دلسوزی اور ہمدردی کے عناصر نے اسے انسان دوستی اور حقیقت بینی کے اظہار کی صلاحیت سے ہمکنار کیا ہے۔ اگر ایک طرف اس نثر کے اجزائے ترکیبی روایتی صنائع بدائع ہیں تو دوسری طرف ندرت پسندی، انفرادیت، شوخی اور ذہانت پر اس کی اساس قائم ہے۔

قدرتِ بیان اور لہجے کے زیر و بم، جملوں کے آتار چڑھاؤ اور الفاظ کے صوتی و معنوی در و بست نے غالب کی نثر کو ایک مخصوص آہنگ دیا ہے۔ ان خطوط میں بیانیہ اسلوب کو بیشتر اپنایا گیا ہے۔ تاہم موقعہ اور محل کے اعتبار سے توضیحی انداز کی کامیاب مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اسی طرح موضوع، مواد اور ذہنی کیفیت کی مناسبت سے گاہ گاہ منطقی اور استدلالی رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ان اسالیب نے اردو نثر

کو جدید ادبی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت دی ہے۔ چنانچہ غالب کے اسلوب نے اردو نثر کو نئی زندگی دی اور اظہار خیال کی نئی سمتیں متعین کرنے میں مدد دی۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی تحریروں کے واسطے خطوط غالب نے بالواسطہ زمین ہموار کی۔ ہر چند کہ یہاں سرسید کی مخصوص طرزِ فکر کا سرچشمہ ناپید ہے۔ لیکن ان میں اپنی ایک دنیا آباد ہے جس کا محور خود مکتوب نگار کی ذات ہے۔ اس دنیا کی حدود میں انفرادیت کے باعث نئے دور کی چاپ سنی جا سکتی ہے۔ غالب کے خطوط کا یہ لب و لہجہ ماضی کی نسبت مستقبل سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

انتخابِ خطوط

علاؤ الدین احمد خاں علائی

(۱)

مولانا نسیمی!

کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر[1] خلیفۂ اوّل ہے (تو) تم خلیفۂ ثانی ہو۔ اُس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی[2] ہے۔ جانشیں دونوں مگر ایک اوّل اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خدا داد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیر غمزدہ دل کو تکلیف دو؛ علاؤ الدین خاں! تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا: وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں[3] کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے

۱؎ ضیاء الدین احمد خاں ہیں۔

۲؎ یعنی مکتوب الیہ عمر میں چھوٹا اور رتبہ میں بڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ نیر کو کیوں جانشیں بنایا؟

۳؎ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ تھے۔ اُن کے بعد امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ پھر امجد علی شاہ اُن کے بعد واجد علی شاہ۔

بھی پرسے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ تاریخی نام ڈھونڈونگا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط پہنچنے کا میں ضامن۔[۱]

پنجشنبہ۔ ۴۔ ماہ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء — غالب

۲۔ جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عم نامدار[۲] سے سنا تھا کہ لغات "دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے

---

[۱] عبارت سے ظاہر ہے کہ علائی نے غالب سے محلے کا پتہ پوچھا تھا۔ اس سے میرزا کے احساسِ شہرت و عظمت کو ٹھیس لگی اور نہایت دلچسپ انداز میں اس کا اظہار کیا۔

[۲] ضیاء الدین احمد خاں نیر

اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔ خیر؛

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں ہواخواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں۔ کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے؟ رہی دید وادید، اس کی دو صورتیں ہیں: تم دلّی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا[1]۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں[2]۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔

[1] اس سے مراد کلکتہ کا سفر ہے، جس میں غالب نے دو سال سات ماہ گزارے۔

[2] ہتکڑیوں سے مراد عارف کے بچے باقر علی اور حسین علی خاں ہیں، جنھیں مرزا، عارف اور بیوی اور والدہ کی وفات کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے۔

بے حیا ہوں۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا[1]۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازیں وادیٔ ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظ کی تحویل میں بھیجتا ہوں۔ بھائی صاحب کی نذر

از جسم بجاں نقاب تا کے؟	ایں گنج دریں خراب تا کے؟
ایں گوہریۂ فروغ یارب!	آلودۂ خاک و آب تا کے؟
ایں راہروِ مسالکِ قدس	واماندۂ خورد و خواب تا کے؟
بیتابیِ برق جز دمے نیست	ما دیں ہمہ اضطراب تا کے؟
جاں در طلب نجات تا چند؟	دل در تعب عتاب تا کے؟

۳۰

میری جان؛

سن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک قطرہ برہم زون مینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے

[1] پہلے سفر رام پور کی طرف اشارہ ہے یعنی بیوی کو دلی میں چھوڑا اور بچوں کو ساتھ لے گیا۔

ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمھارے خط کا جواب
ضرور۔ لو سنتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ غلام حسن
خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا
ہوں کہ اونٹ شُتر کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم[1] نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے
حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو
شامل اُن اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور
ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر
کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا
ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ جواب
لکھتا ہوں:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار — گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدما میں، اور عرفا میں ہے۔ جیسا عراقی۔ ان کا
کلام دقائق حقائق تصوف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعرا میں صائبؔ و کلیمؔ کا ہم عصر

---
[1] غالب کے خسر الٰہی بخش خاں معروف۔

اور ہم چشم۔ ان کا کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی طرز و روش میں زمین و آسمان کا فرق۔
بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، ادھر متھرا داس سے
قرض لیا ادھر دربار ی مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک
کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول، نہ سود۔ اس سے بڑھ کر
یہ بات کہ روٹی کا خرچ بھوپی کے سر باینہمہ کبھی خان[1] نے کچھ دے دیا، کبھی الور
سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے
کلکٹری[2] کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود
ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا،
بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارہ مشکل
ہوگیا۔ روزمرہ کا کام بند ہونے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں
قہر درویش بجان درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو
شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے
پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا، نہ پیوگے
تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا
نقدا۔۔۔ م پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض متفرق ادا کیا گیا، متفرق رہا،
خیر ہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔
چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی کی پوچھی تھی، اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا
اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا؛

اے بے خبر ز لذتِ شرابِ دوامِ ما

---

[1] خان سے مراد نواب احمد بخش خاں مرحوم ہیں جو الٰہی بخش خاں معروف کے بڑے بھائی، فیروز پور جھرکا اور لوہارو کے نواب تھے۔

[2] خاندانی پنشن جو کلکٹری کے خزانے سے ملتی تھی۔

دیکھا؟ ہم کو یوں پالا گے ہیں۔ دریبہ کے بلیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ، وحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کر دوں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ سنو، مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمان حق کو گناہ جانوگے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے جن روزوں میں تم علاءالدین خاں کو "گلستاں" اور "بوستاں" پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں، نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں۔ علاؤالدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم با چشم پرآب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف نادوں کو ہمدرد اور دا

کو چشم نمائی سے بڑھاتے ہیں، مارتے نہیں۔ تم نے بجا کیا۔ آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین[۱] طفل سے گزر کر، پیر ہفتاد سالہ[۲] کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے: چوں پیر شدی حافظ الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعۂ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے، اور ہزاروں اس کے مخالف ہیں۔

صوفی بیا کہ آئنہ صاف است جام را | تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
شراب ناب خور و روئے مہ جبیناں بیں | خلاف مذہب آناں جمال ایناں بیں
ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما
ساقی بکر وظیفۂ حافظ زیادہ داد | کاشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی[۳]

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں، ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی

---

[۱] نواب علاؤالدین [۲] غالب [۳] اس مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خاں نے نواب علاؤالدین خاں کے خط میں میرزا غالب کو لکھوایا ہوگا، اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلادو۔ برسات گزر جائے گی مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یک شنبہ۔ ۲۰ جولائی ۱۸۶۲ء　　　　غالب

۴۔

میری جان!

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری اور اس کی ماں کی اور اُس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمہاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تاکہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا۔ توبہ توبہ خط کاہے کو ایک تختہ کاغذ کا۔ میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ محوائے عبارت سے خون جگر نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا، ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور، ایسا عیار طرار، یوں عاجز و درماندہ و از کار رفتہ ہو جائے۔ تمہارا غم جدا، ساغر اول اور درد۔ کیا دل لے کر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کیا علم لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوہ کی داد نہ پائی۔ گویا نظیری تمہاری زبان سے کہتا ہے

جوہر ہنرش من در تہ زنگار بماند　　　　آنکہ آئینہ من ساخت نپرداخت دریغ

بھائی اس معنی میں میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد[1] ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں مگر

[1] ہم درد سے مراد [illegible] نہیں بلکہ جو درد کہیں [illegible]

مجھے اپنے ایمان کی قسم! میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایستہ[1] پائی نہیں۔ آپ ہی کہا
آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی[2] میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے
ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں
اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں
کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ[3] کہ ایک
عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر
میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

نہ بستاں سرائے، نہ میخانہ ای — نہ دستاں سرائے، نہ جانانہ ای
نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامشگراں در رباط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ تمہارے
حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا
لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال
کوفہ میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان
ہے۔ اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے
نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

صبح دوشنبہ شانزدہم از ماہ صیام ۱۲۸۱ھ
یعنی ۱۳ر فروری ۱۸۶۵ء

---

[1] جیسی پانی چاہیے تھی۔
[2] جمع داعیہ یعنی ارادے، آرزوئیں۔
[3] قدرت۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر ورخشاں

۵۔

جناب قبلہ وکعبہ!

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جاتے۔ میرا کلام شہرت پاتے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی، تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہ بیت کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمہارے بھائی اور تمہارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ لکھنؤ سے لے کر بھیج دو، وہ اگر دو ہیں تو میں کیا کر دوں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص، بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیئے گئے ہیں اور اس میں اسی وجہ سابق

۱؎ ضیاء الدین احمد خاں عمر میں میرزا غالب سے چھوٹے تھے، لیکن انھیں قبلہ وکعبہ غالباً اس وجہ سے لکھا کہ صاحب علم و امارت تھے۔ یہاں دیوان سے مراد فارسی کلیات نظم کا نسخہ ہے۔

کے نام پہ ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان، جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں دو قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ یہ شعر غلط، یہ مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں[1]

رحم و کرم کا طالب غالب

[1] اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ بہ ظاہر ۱۸۶۶ء کا معلوم ہوتا ہے۔ جب کلیات نظم فارسی منشی نول کشور کے مطبع میں چھپوانے کا خیال آیا تھا۔

مرزا قربان علی بیگ سالک

۶-

میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھ کو پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرامگاہ" و "عرش نشیمن" کا خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ"[1] خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر"[2] ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں:

---

[1] یعنی دوزخ اس کی جائے قرار ہو، ہاویہ اس کا زاویہ ہے

[2] غالب کو شاہی دربار سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا تھا۔ نجم الدولہ اُن کے خطاب کا ایک جزو تھا جو ترکی زبان میں خطاب کے لیے احترام کا لفظ، جیسے ہمارے ہاں جناب ہے۔

"اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کہیے' اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو' کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا' بے غیرت' کوٹھی سے شراب' گندھی سے گلاب' بزاز سے کپڑا' میوہ فروش سے آم صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا' کہاں سے دوں گا۔

منشی ہرگوپال تفتہ

۷۔

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ، تحریریں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم کہ فرزند تھا۔ اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ بس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا؟

لہ زین العابدین خاں عارف غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین خاں مسرور کا فرزند اور بیگم غالب کا حقیقی بھانجا تھا۔ مسرور نے اپنی بیوی بنیادی بیگم بنت الٰہی بخش خاں معروف کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی اور عارف قریبی رشتے کی بنا پر نیز خوش فکری کے باعث غالب سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ۳۵ برس کی عمر پائی۔ جمادی الآخر ۱۲۶۸ھ (اپریل ۱۸۵۲ء) میں انتقال کیا۔ اس کے شاگرد الگزانڈر ہیدلے متخلص بہ آزاد نے جو "سالک صاحب" مشہور تھا، مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ وفات نکالی تھی جس میں سے ایک کا تخرجہ تھا۔

عارف پسند رحمت حق ہو چکا ہے آج

عہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔

آپ اُن کو جلد بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے کہ میں اُن کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد اُن کو تمہارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو اُن کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط اُن کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے۔ اُن کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آلو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا۔

نگاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء اسد اللہ

(۹)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اُس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اُس کا نام بھی دلی اور اُس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ

اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان[۱] سے عہد لیا تھا کہ بر وقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آتے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست[۳] یازدہم مئی[۴] سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر

---

۱ انگریز۔ ۲ یعنی [illegible]

۳ مارشل لا۔ ۴ تاریخ ابتدائے ہنگامہ ۱۸۵۷ء

ٹٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم ز نہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے۔ مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

۹۔

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دے دیا تھا۔ گرمیٔ ہنگامہ انطباع دیوان وغیرہ میں پہلے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصرف کاغذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے، مغتنمات میں سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو فسانۂ عجائب لکھا ہے آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے، اور یاد رکھنا فسانہ کے واسطے کتنا مناسب۔

منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے اور تہنیت کا بھائی[۱] کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو اُن سے ملو تو میرا سلام کہہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا۔ مولوی محمد شفیع صاحب کا بہ ضرورت معاودت فرمانا مجھ کو اطلاع دینا۔

میرا حال بدستور:

یہاں پہلو، یہاں بستر، یہاں درد

شنبہ ۲۶ جون ۱۸۵۹ء روز ورود نامہ — غالب

---

[۱] مولوی قمرالدین کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۰۱

میری جان!

کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

انت متا سوم شتّا۔ مصری میٹھی، نمک سلونا۔ کبھی کسی شئے کا مزا نہ بدلے گا۔ اب جو میں اس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالب کیا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اس سے کیا رسم و راہ ہے؟ بے شبہ جانے گا کہ تفتہ نے لکھا ہوگا۔ میں اس کی نظر میں سبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے۔ بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے! زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا۔ اس کو چچا ہو تم جانو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اس کو لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔

تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمھارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندرآباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء غالب

لہ آخری نتیجہ ہی درست ہوتا ہے۔ یعنی کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

۱۱-

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور،

پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں۔ اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا۔

شرط اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من است

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اوس کے دو دن یا تین دن بعد دوسرا خط پہونچا۔ سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اوس میں بے تکلف عمر بسر کرے اوس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ معزط بہ طرف شعر و سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے سب اشعار بھول گیا ہوں۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل اولٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے ؟

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں، تو یہ مصرع پڑھکر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں ! تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اوس کا بیان تو معلوم، مگر اوس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اُوس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کا زیست کیوں کر نہ دشوار ہو! ہائے، اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

حاتم علی بیگ مہر

۱۲

مرزا صاحب

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ ہاں اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔

مرزا تفتہ نے بات ترس سے یہ خبر دی کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے، بھر اب کتابوں کی جلدیں بن جانے کی خبر ہے اور اُن پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری بچالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو خدا کرے تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔

ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کر رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں:

غزل

درد منت کش دوا نہ ہوا ۔۔۔ میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ ۔۔۔ اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے ۔۔۔ لے کے دِل، دلستاں روانہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما ۔۔۔ کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ۔۔۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا!

۱۱۳)

شہرا اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے تو غائب ز نظر، مہر تو ایمان من است

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ مرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اُس کا منشا کیا ہے۔ کبھی میں نے بزم احباب میں کہا ہو گا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو

جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں۔ اور بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے "مغل جان" سے سنا تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر "مغل" سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھے رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پہ داڑھی سر پہ بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔

صاحب بندہ نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمسٹن صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نظر بھیجی تھی، سو ان کا فارسی خط مورخہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کے قصیدہ فارسی بھیجا، اس کی رسید میں نظم کی تعریف اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب

جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا، کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آ گیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام وہ اب پہنچا دیں گے۔

مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۳۷)

میرزا صاحب!

آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب، شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلا اس کے سامنے مری تھی، تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوکہ لیلا اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی "مغل بچے" بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغل بچہ" ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اُن دونوں

کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی — عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ

اللہ بس ماسوا ہوس۔

غالب

۱۵

مرزا صاحب!

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چنا جان" نہ سہی "منا جان" سہی میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ:

زن نو کن اے دوست در ہر بہار — کہ تقویم پارینہ ناید بکار

میرزا مظہر کے اشعار کی تضمین کا مسدس دیکھا۔ فکر سراپا پسند، ذکر بہ جہت ناپسند اپنے نام کا خط مع اُن اشعار کے مرزا یوسف علی خاں عزیز کے حوالے کیا۔

مکرمی نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔ پروردگار اُن کو سلامت رکھے۔ مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کے مجھ سے فارسی عبارتیں خط لکھوایا، میں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے۔ وہ عبارتیں جناب قبلہ و کعبہ کو دکھائیں گے۔ اُن کے مزاج اقدس کی خیریت عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں۔

یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم

اب مجھے اُن سے یہ استدعا ہے کہ دستخط خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو، وہ سب اس خط میں درج کریں۔

غالب ۱۸۶۰ء

منشی شیونرائن آرام

۱۶

برخوردار منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سنو!

تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں[1] دہمدانی[2] میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو

[1] نجف خاں صفوی ایران کے شاہی خاندان سے تھا
[2] ہمدانی سے مراد بظاہر محمد بیگ ہمدانی ہے۔

تمھارے دادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے
کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب[1] کے ساتھ
ہیں۔ اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر
اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی
بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر
اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی
چونکہ گھر اُن کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ پس ہمارے
اور اُن کے مکان میں چھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی
حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری
پر میری نشست تھی اور پاس اُس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس
دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ
وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹرا کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے
پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی
ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور کٹروں کا کرایہ اوگاہ کر
اُن کے پاس جمع کراتا تھا۔

سنو تو سہی، تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداره
اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگزاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے
تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از روئے تفصیل جلد مجھ کو لکھو۔

روز سہ شنبہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ وقت ورود خط — اسد اللہ

[1] خاں صاحب سے مراد خواجہ غلام حسین خاں ہیں، جو غالب کے نانا تھے۔

میر مہدی مجروح

١٧

صاحب،

دو خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے، داڑھی منڈے، بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا، صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا "اشرف علی"۔ قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا سیّد ہیں۔ پیشہ پوچھا، حکیم نکلے۔ یعنی حکیم اشرف علی۔ میں اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔ کتنے اوچھے ہو۔ "مصطلحات الشعرا" "مصطلحات الشعرا"۔ بھائی وہ کتاب تمہاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا۔ بھیج دوں گا۔ تقاضہ کیوں کرو؟ میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جلدی نہ کرو۔ دیر آید، درست آید۔

سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیرالدین کو دعائیں۔

صبح چہار شنبہ ہفتم رمضان ۱۲۷۵ھ

بستم اپریل ۱۸۵۹ء غالب

١٨

واہ واہ سید صاحب، تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود

نمایاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو۔ کیا نیل کیا رود نیل یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں

چوک[1] میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازہ کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں، پنسن داروں سے حاکموں کا کچھ کام نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میرن جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار۔ میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آئے۔ سلام علیکم، مزاج مبارک، کہیے مولوی

[1] چوک سے مراد یقیناً چاندنی چوک ہے۔

مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میرا
اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں
کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں، وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں
کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیوں
کر یک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ! اللہ! اللہ!

بدھ۔ ۲۳، دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

۱۸

میر مہدی

جیتے رہو آفریں ہزار آفریں۔ اردو عبارت کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو
رشک آنے لگا۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ
طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پتی، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا
لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسکو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔

میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہ سمجھ لو۔ والرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک
خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں
شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے روپیہ یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ
منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو۔ تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمھارے پاس
بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بطرز مناسب ہو گئی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ
مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپیہ کی ضرورت ہو
تو سو روپے خزانہ سے منگوا لو۔ میں نے کہا، صاحب! یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس

ل اس سے مراد میر مہدی ہیں جو غدر کے زمانے میں دہلی سے نکل کر پانی پت چلے گئے تھے اور انصاریوں کے محلے میں رہتے تھے

دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلوائے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ پنجم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیہ منگالوں۔ پر یار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر او۔ تم دیکھ کر لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے چنانچہ حاکم دلی نے ایک کتاب بھی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھو حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا، مجھے باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین، میرن صاحب میر نصیر الدین کو دعا۔

۷ مارچ ۱۸۵۹ء — از غالب

۱۹

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم

حضرت آداب!

"کہو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور، میں کیا منع کرتا ہوں؛ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟"

نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا

ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔"

"حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔"

"بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا، اور پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"

"میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہ لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

سنو، میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ رفع ہو گئی، پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو میسر ہی نہیں۔ تمہارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو، بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں، حکیم میر اشرف علی ہیں اور اُن میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو اُن سے یہ پوچھو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی۔ اور یہ بھی معلوم کر بھیجو کہ جو زبان زد مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد"، اس کے معنی کیا ہیں؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک یہ نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو

ے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ! تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء غالب

---

(۱۴)

میاں!

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی سسرال میں قیامت برپا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی تھیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا تھا چیخے، کو اگر نالہ چاہے چپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے گئے۔ ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنی جدی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند سا تلا کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے۔ اور قلاقند تمہاری نذر کر کے تم پر احسان دھریں گے "بھائی میں دلی سے آیا ہوں اور قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں"۔ زنہار نہ باور کیجیو۔ مال مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کھلوا دیا نہ؟ سر پہ قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ پر کاجل دو۔ بلکہ میں بھی قسم

لکھتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو، مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر دروازہ تک اُن کو پہنچا گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو اُن پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلما، مولوی سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا، طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، ہم آدمی بنا چاہے، خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام، یہی ہے مذہب حق والسلام والاکرام علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

مئی ۱۸۶۰ء غالب

• — • — • — • — • — • — •

(۴۱)
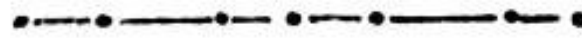
سید صاحب،

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پہ مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ اُن کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشق نہیں۔ بندہ مہر و وفا ہوں گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں۔ وہ آئیں گے تو یہیں اُن کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا۔ آج سہ شنبہ غرہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہرا برسات نے نہ آنے دیا۔

برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سنو: ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دل کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن صاحب کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں!

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۹ھ۔ ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء غالب

نواب انور الدولہ شفق

(۲۴)

پیر و مرشد، بارہ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا

سرے سے سنیے: آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کمی کئے ہوئے شعر لوٹ آئے۔ اُن کی قباحت پوچھی گئی، قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیئے گئے۔ لو صاحب، یہ اشعار بھی قصیدہ میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرارالحق کے نام کا کاغذ اُن کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا، آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا۔

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں۔ خیر اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے؟ یا سی کرتے ہیں اُبال کیا آئے؟ بندگی بیچاری۔

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا؛ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[1] کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین

---

[1] انگریزی فوج جنھیں خاکی غالباً اس وجہ سے کہا کہ اُن کی وردی خاکی رنگ کی تھی۔

و آثار و ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں: ایک بڑا[۱] لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش، کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینہ درکار ہے۔ کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا

اہاہا، جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی خاں[۲] غدر سے کچھ پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں! حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں اُن کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جا سکے، یہیں رہے، بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین[۳] کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابرِ شہر بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے۔ سال گذشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے اُن کی صفائی ہو گئی۔ لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے، وہ اور خواجہ حبیب اللہ کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں

---

۱ باقر علی ابن عارف۔ ۲ غالب کے دوست تھے۔ شاہی دربار میں کسی اچھے عہدے پر مامور تھے۔ ۳ فرزند شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں۔

نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوئی اور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی، جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہے، وہ اُن کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاکپٹن گئے ہیں۔ شاید بہادر پور بھی جائیں گے۔

۱۸۶۰ء

حکیم غلام نجف خاں

۲۴۔
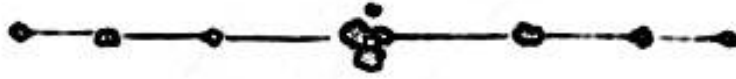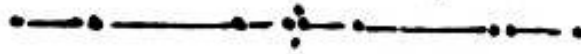
صاحب،

کل آخر روز تمہارا خط آیا۔ میں نے پڑھا، آنکھوں سے لگایا، پھر بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انھوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ ماکتب فیہ معلوم کیا ہوگا۔ تمہارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا دل گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہ ظہیر الدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے؟ کے برس کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے۔ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو، بدستور ہے۔

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

جاڑا پڑ رہا ہے، تو انگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازہ آبکاری ہے، ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی فضل حق صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام شہید آگئے ہیں۔ وہاں میں بھی الدولہ محمد یار خاں صورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، ہم یہ نہیں جانتے کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

کیوں ظہیر الدین، کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے

باپ کے شامیں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا؟ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، تیری بندگی لکھ دی۔ تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

صبح یک شنبہ۔ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۵ء   غالب۔

سید یوسف مرزا

(۲۴)

یوسف میرزا،

میرا حال سوا میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک[1] سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصرالدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا انیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں و مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غمِ فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ

---

[1] لال قلعہ کو قلعہ مبارک کہتے تھے۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پے در پے رنج پہنچے تو شدتِ غم میں اسے نامبارک کہہ دیا۔

ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے! گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے والے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اسی کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مدری کی جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم[1] سے کچھ آئے جاتا ہے، وہ بقدر سدرمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق[2] جو بقدر طاقت بناتے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں، نہ گنہ گار ہوں، نہ مخبر نہ مفسد۔ بھلا اب تم ہی کہو اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں، تو نذر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات

---

[1] یعنی رام پور سے
[2] شراب

خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ جو ستّر بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دیا۔ وہ پہلی دسمبر
کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے۔

ز سال نو دگر آئینہ بند کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس میں التزام اپنی تمام سرگذشت کے لکھنے کا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔
بیرے آوازۂ روشن گہر جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا۔ اس بجھے
ہوئے بلکہ مرے ہوئے دل پر کلام کا یہ اسلوب ہے۔

جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے
اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ[1] کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے
بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ
بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی منقبت ہے کہ جس کا ذکر
بطریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو غرض دستگاہ سخن منظور نہیں،
گدائی منظور ہے۔

بہرحال یہ تو لکھو قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ پرسوں تمہارے ماموں کا خط آیا۔ اُس
میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں، اس تفرقہ کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟
اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہوا؟ یہ
امور جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ املاک واقع شہر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا؟

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل میں نے فرد فہرست، دیہات و باغات و املاک مع حاصل
ہر یک باغ وغیرہ واگزاشتہ ناظر جی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ
فرد کلکٹری کے دفتر سے لی ہے۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ شہر کی عمارت جو سرکار میں نہیں آئی

[1] واجد علی شاہ۔

اور برسات ہی ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے۔ کرایہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی املاک کا علاقہ حسین میرزا کے واسطے ملحوظ ہے۔ میں تو پنسن کے باب میں حکم اخیر سن لوں پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت، ذلت و عزت جو مقسوم میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر علی علی کہتا ہوا ملک عدم آباد کو چلا جاؤں۔ جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں: "یا علی یا علی یا علی"

میاں ہم تمھیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برہما کا پتر دو دن بیمار پڑا رہا تیسرے دن مر گیا ہے ہے کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اس کا شیو جی رام اس کے غم میں مردہ سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے؛ ایک مردہ، ایک دل افسردہ کون ہے جس کو تمھارا سلام کہوں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فرد ان سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے اس پر حصول مطلب کی بنا اٹھانا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔

ضیاء الدین خاں ٹونک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے[1]۔ دیکھیے آ کر کیا کہتے ہیں۔ یا رات کو آگئے ہیں یا شام تک آجائیں۔ کیا کروں کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں۔ مرتضیٰ علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے حصہ برادرانہ کروں۔ نصف حسین میرزا اور تم اور سجاد، نصف میں، مفلسوں کا مدار حیات خیالات پر ہے مگر انھیں خیالات سے ان کا حسن طبیعت معلوم ہوجاتا ہے۔ والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء، وقت صبح

---

[1] ان سے کچھ روپے سجاد دینا اور حسین میرزا کو سمجھانے کا جو خیال تھا وہ اس وقت پورا نہ ہوا۔

(۲۴)

یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا خط کل شنبہ کو پہنچا۔ آج بدھ، ۱۶ شوال اور ۹ مئی کی ہے۔ اس کا جواب بھیجتا ہوں۔ خدا کی قسم تامس بدرلے صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں الگزنڈر صاحب سے ہے۔ سو ان کے نام کا خط لکھا ہوا تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر بند کر کر ان کو دو اور ان سے ملو اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔ احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانیں کہ کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کس ہتھیار کا نام اور سکندرہ کون سے درخت کا پھل ہے۔ میرا اردو کا دیوان میرٹھ کو گیا، سکندر شاہ لے گئے ہیں۔ مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں ان کی رسید آگئی نہ "برہان قاطع" نہ "قاطع برہان"۔ کل جس وقت تمہارا خط آیا اس وقت منشی میر احمد حسین میرے پاس بیٹھے تھے اور اس وقت سالک مجذوب بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دونوں صاحب تم کو اور بھائی فضلو کو سلام کہتے ہیں اور بھائی فضلو سے یہ کہہ دینا کہ باتفاق رائے منشی میر احمد حسین اب باغ کی درخواست کی عرضی بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔ تمہارا کاغذ قیمتی ایک روپیہ کا منشی جی کے پاس موجود ہے۔ وہ اس کو بیچ کر روپیہ تم کو بھجوا دیں گے۔
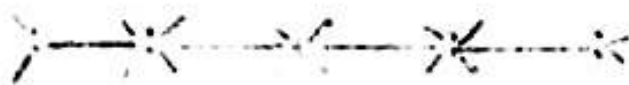
۱۶ شوال (۱۲۷۶ھ) و ۹ مئی (۱۸۶۰ء)

۲۵

یوسف مرزا!

کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب

۱؎ انگریز بدرلے کا ایک کلکٹر آزاد تھا اور دوسرا الکزنڈر اسکنر انڈر تھا [illegible]

۲؎ یوسف مرزا کے باپ کا نام محمد نصیب تھی اور وہ [illegible]

کیا کرو گے مہر! یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف میرزا کو۔

تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی اور نہ قید فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ پنسن کا روپیہ مل گیا تھا وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس مقید ہوا ہو، اس کا پنسن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟

مصطفیٰ خاں[1] کی رہائی کا حکم ہوا مگر پنسن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں لیکن یہ عجیب بات ہے، تمہارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو[2]۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے سوچے ہوں گے کہ ان دنوں میں اپنا کام نکال اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہی تھا تو اُن کا گمان غلط تھا، اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر تمہاری دادی کا خط جو تمہارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا وہ میں نے تمہارے ماموں کو بھیج دیا۔ ان کی جاداد کی واگزاشت کا حکم تو ہو گیا ہے، اگر ان کے بڑے بھائی کے بادآں کو چھوڑ دیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

مظفر میرزا کو دعا پہنچے۔ تمہارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمہارے چچا کا آنا اچھا ہے خدا کرے انجام اسی کے مطابق ہو۔ اُن کا مقدمہ دیکھو کہ تمہاری پھوپھی کا اور تمہارا سرانجام دیکھا جائے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہو گیا؟ آگرہ جانا، وہاں کی گفتگو توقف ... [illegible]

---

[1] شیفتہ
[2] [illegible]

پنسن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے۔ جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام۔ میاں ناظر میر کاظم علی دعا۔

مرقومۂ شنبہ، ۲۴ شوال (۱۲۸۶ھ) و ۱۹ مئی سال حال (۱۸۶۹ء) غالب

میر حبیب اللہ ذکا

(۳٦)

میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے بیچ پوچھ کے ملنے والے، مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کا سفر کارہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔

پہلا خط تمھارا پہنچا، اس سے تمھارا مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا سب شعر اچھے اور لطیف۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بدلا گیا تھا۔ غرض کہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجیو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا، گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے

لہ نسخہ جو صفحہ [illegible]

کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔ صاحب، میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو، وہیں رہ جانے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک ہرکاروں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر[1] کا تذکرہ مانگتے ہیں۔ اس کا یہ حال ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔

بس اب مجھ کو اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی حجہ ۱۲۸۲ھ، ۱۲۔ مئی ۱۸۶۶ء جواب کا طالب غالب

عبدالرزاق شاکر

(۲۶)

جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر کی خدمت میں

بعد سلام یہ التماس ہے کہ مولوی صاحب عالی شان مولوی مفتی اسداللہ خاں بہادر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہنچائیے۔ میں تو آپ سے عرض کرتا ہوں، اگر آپ مفتی صاحب سے کہیے کہ مجھ کو باوجود شدت نسیان آپ کا تشریف لانا یاد ہے۔ جیسا پہلے کے اجزا اٹھا کر میں نے آپ کے سامنے ایک غزل اپنی پڑھی تھی، جس کے دو شعر تذکرہ میں ہیں۔

---

[1] میرزا قادر بخش صابر معزالدین جہاندار بادشاہ کی اولاد میں سے تھے "گلستان سخن" کے نام سے شعراء کا تذکرہ لکھا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔ مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تذکرہ خود صہبائی نے لکھا تھا اور صابر کے نام سے شائع ہوا۔

از زندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست | خود را بخاکِ رہ گزر حیدرا فگنم
منصور فرقہ علی اللھیاں منم | آوازۂ "انا اسد اللہ" در افگنم

اخی مکرم میر قاسم علی خاں کو سلام پہونچے۔ سال گذشتہ کی تعطیل کی طرح دلی آکر مجھ سے بے ملے نہ چلے جایئے گا۔ پھر حضرت مکتوب الیہ سے کام ہے۔ اشعار بعد حک و اصلاح کے پہونچتے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔ کہ میں آپکے کلام میں دخل و تصرف کروں۔ بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اُردو ہی میں نیازنامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے، ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروج میں مکاتیب و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموعہ شیرازہ بستہ، چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عالم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے؟ جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق و بار سے دست و بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموعہ دیکھا ہو کہ جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں انھیں جناب احدیت جلت عظمتہ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع اربابِ فن

فرمائے۔ اور میں اب انتہائی عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراضِ جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں، کچھ یادِ خدا بھی چاہیے نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس امید وار ہوں کہ آپ انھیں نذورِ محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔ اور درویش دل ریش و فرد ماندہ کشا کش معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ما سوے ہوس ۱۲۔

تعقید معنوی کو حضور خود جانتے ہوں گے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہٰذا خامہ فرسائی بروئے کار نہیں آتی ۱۲۔

منشی نبی بخش حقیر

(۲۸)

بھائی صاحب! آگے اس سے دو خط تم کو بھیج چکا ہوں۔ ایک بطریقِ ڈاک اور ایک حکیم الٰہی بخش کے ہاتھ۔ کل میں قلعہ سے آتا تھا۔ راہ میں مرزا احسن علی بیگ ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں کل جاؤں گا یعنی آج۔ یہ تم کو معلوم رہے کہ کل پنجشنبہ تھا۔ ۲۹ رجب اور ۲۱ مئی کی اور آج جمعہ ہے۔ غرض کل رات کو یا کھل کا مربہ مرتبان میں رکھ کر اور اس کو موم جامہ سے بند کیا۔ اور اس پر اپنی مہر کر کر کلّو کے ہاتھ مرزا کے پاس بھجوا دیا۔ کلّو ان کو مربہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلّو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا احسن علی بیگ نے ہنڈی لکھی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا۔ پرسوں جاؤں گا۔ اور مرتبان کو اچھی طرح سے لے جاؤں گا۔ حضرت کو معلوم رہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی عنایت سے مربہ ہاتھ آ گیا ورنہ اکثر سائلوں کو سرکار شاہی سے اچار ملتا ہے۔ مربہ نہیں ہاتھ آتا۔ اب اختیار مرزا صاحب کا ہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں اس کو لے جائیں۔ بندہ بری الذمہ ہے۔

اجزائے تواریخ تیموریہ لکھے جاتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی جزو لکھا جاتا ہے۔ وہ میرے پاس آتا ہے۔ میں اس کے حاشیے پر معنی لغات لکھتا جاتا ہوں۔ چنانچہ تین جزو لکھ چکا ہوں۔ یعنی تین جزو لکھے ہوئے میرے پاس آ چکے ہیں۔ اور میں ان کا حاشیہ لکھ چکا ہوں۔ جب سب آ چکے تو بسبیل پارسل ارسال کروں گا۔ چھوٹی تقطیع خوش آیندہ پر گیارہ سطر کے سطر سے لکھے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ گیارہ بارہ جزو ہوں گے گویا دو ثلث تحریر

باقی ہے۔ خدا کرے جلد تمام ہو تاکہ میری شرمساری رفع ہو۔

جوالا سنگھ دو بار میرے پاس آیا۔ میں نے رقعہ لکھ کر ایک ایسے شخص کے پاس بھیجدیا کہ وہ مرجع ہے اس محکمے کے اہلِ مقدمہ کا۔ اگر حاجت ہوگی اور جوالا سنگھ خواہش کرے گا تو میں اس کو مولوی صاحب کے بھی سامنے کر دوں گا۔ تم مجھ کو حکیم الٰہی بخش کا حال لکھو۔ کر وہ تم سے ملے اور سکندرہ راؤ کو گئے۔

تفتہ کا حال لکھو کہ یہیں ہیں یا اکبرآباد کو گئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آج شام تک تمہارا خط میرے پاس آ جائے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھیجا ہے اور شام کو ہرکارے نے تمہارا خط آ کر دیا ہے۔ یہاں عجب تفاق ہے کہ جیٹھ کا مہینہ ہے اور روز مینہ برستا ہے اور جاڑا پڑتا ہے۔ لوگ شب کو رضائیاں اوڑھتے ہیں اور میں لحاف۔ نوروز سے یہی صورت دیکھتا ہوں کہ دن رات مینہ برستا ہے اور سردی کی شدت ہے۔ دو دن گرمی پڑی اور تیسرے دن مینہ آیا۔ اور دو چار دن بارش رہی۔ تم بھی لکھو کہ تمہارے شہر میں کیا عالم ہے۔

سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی۔ کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔

آج آپ نے دریافت کیا ہوگا کہ جی چاہا تم سے باتیں کرنے کو۔ یہ میں

باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں جو مکالمہ زبانی میں ہوتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا ہوں تم کچھ نہیں کہتے۔ وہ بات کہاں کہ میری بات کا تم جواب دیتے جاتے اور تمہاری بات کا میں جواب دیتا جاؤں۔ کیا کروں عجب طرح سے زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے حالات سراسر میرے خلاف طبیعت ہیں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کاغذ تمام ہوگیا اور ہنوز باتیں بہت باقی ہیں۔ اس خط میں میں نے اپنے بچوں کو بھی دعا نہیں لکھی۔ بھائی تم کہہ دینا۔ اپنے خط میں اُن کی خیر و عافیت لکھنا۔

یکم شعبان ۱۲۶۸ھ (۱۲ مئی ۱۸۵۲ء بروز جمعہ)

(۲۹)

بھائی صاحب۔ آپ کے دو خط آئے۔ پہلے خط میں آپ نے ایک بیت کے معنی پوچھے ہیں، وہ سنیے

تو گوئی مگر سبزہ زیر زمیں | فروزاں فنوہ بود پشت نگیں

یہ شعر شب معراج کی توصیف میں ہے کہ وہ شب ایسی روشن تھی...... کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی کہ جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے۔ آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینہ کے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے۔ پس جس نگینہ کے نیچے آفتاب ڈانک ہوتا ہوگا وہ نگیں کتنا درخشندہ ہوگا۔ فنوہ فارسی لغت ہے یعنی ڈانک کے۔

دوسرے خط کا جواب کیا لکھوں؟ تم سے شرمندہ ہوں۔ پنڈت جوالا ناتھ صاحب

سے شرمسار۔ میں جو تاریخ تیمور یہ لکھتا ہوں تو صرف حالات و واقعات لکھتا ہوں
ملک کی جمع بندی اور اضلاع و مضافات کی تحقیقات سے مجھے کام نہیں۔ اور علی گڑھ یہ کول
صوبہ نہیں۔ سرکار ہو تو ہو۔ اور اس طرح کا معمورہ نہیں کہ کبھی کسی عہد میں بادشاہ
کا تخت گاہ رہا ہو۔ جیسے بدایوں اور جون پور۔ اور کڑا مانک پور کہ یہ بھی مانند کول
کے چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں اور تخت گاہ رہی ہیں۔ کول میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا
دفتر شاہی کا حال کیا لکھوں؟ حضرت فردوس منزل شاہ عالم کے
عہد کا کاغذ سو بھی وہ کہ جنرل لارڈ لیک صاحب کے عرائض اور بادشاہ کے شقوں
کی نقل، وہ تو ہیں اور باقی تمام دفتر موافق مثل مشہور کہ گاؤ خورد ہو گیا جو کتابیں
کہ ہندوستان میں متعارف ہیں وہ بھی تو نہیں۔ ملک کے بندوبست اور پرگنہ بندی
اور جمع بندی کا کیا ذکر۔ جو کچھ پنڈت صاحب نے از روئے ترجمہ آئین اکبری
لکھا ہے اس سے زیادہ کہیں سے ہاتھ نہ آئے گا۔ اگر رقعہ میں یہ نہ لکھا ہوتا
کہ یہ از روئے ترجمہ آئین اکبری ہے تو میں کہیں سے آئین اکبری بہم پہنچا کر
اس میں دیکھتا۔ اب میں کہاں سے دریافت کروں۔ پنڈت صاحب کو میرا سلام کہیے
اور یہ خط اُن کو پڑھا دیجیے۔ میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ
ہوں کہ ان فنون کو کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ کارپردازانِ دفتر شاہی خلاصۂ حالات از روئے
کتاب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی کر کر حوالے کرتا ہوں
میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ
سکتا ہوں۔ مورخ نہیں ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

بھائی صاحب! تمھاری جان کی قسم، میں اس فن سے اتنا بے خبر ہوں کہ یہ

سکا اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پنڈت صاحب نے کیا کچھ لکھ دیا ہے اور وہ کیا ہے جس کی ان کو خواہش ہے۔ میرے بھائیوں میں نواب ضیاء الدین احمد خاں خلف نواب احمد بخش خاں مرحوم کو کہ وہ فن نظم و نثر میں میرے شاگرد ہیں۔ اب جو ان کی طبیعت فن تاریخ کی طرف آئی ہے تو اس میں وہ یگانۂ روزگار اور بڑے دانا و ہوشیار ہو گئے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ کچھ دریافت کر کے لکھ بھیجوں۔ سو انھوں نے کہا کہ آئینِ اکبری کے سوا کسی اور کتاب میں کچھ پتہ نہ پایا جائے گا۔ حالاں کہ کوئی کتاب اس بات کی ایسی نہیں کہ اُن کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اور خلاصہ اس کا حافظہ میں موجود نہ ہو۔ میرا وہ حال جس پر مجھ کو بجھو سر، اس کا یہ بیان۔ بادشاہ کے کتب خانے کی وہ صورت۔ بندگی اور شرمندگی

۲۰ صفر ۱۲۶۹ھ   از اسد اللہ نگاشتہ و رواں داشتہ جمعہ ۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء

(۳۰)

بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہونچا۔ آپکا اتر سے کول آ جانا مجکو معلوم ہو گیا تھا۔ ہمارا ایک قطع نگار اس ضلع میں رہتا ہے۔ حق تعالیٰ اس کو جیتا رکھے۔

گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اس ساٹھ برس میں یہ لو اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی۔ چھٹی ساتویں رمضان کو مینہ خوب برسا۔ ایسا مینہ جیٹھ کے مہینے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب مینہ کھل گیا ہے۔ ابر گھر ا رہتا ہے۔ ہوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر رک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلائے رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزے کو بہلانا اور بات ہے۔

جے پور کا حال آپ کو منشی صاحب کے اظہار سے یا اُن کے نام کے خطوط دیکھ کر معلوم ہو گیا ہے۔ مگر کیوں لکھوں؟ خیر غنیمت ہے۔ یہ کیا فرض تھا کہ جو ہم چاہتے تھے وہی ہوتا۔

ہاں بھائی، پرسوں کسی شخص نے مجھ سے ذکر کیا کہ اردو اخبار دلی میں تھا کہ ہاترس میں بلوہ ہوا اور مجسٹریٹ زخمی ہو گیا۔ آج میں نے ایک دوست کے ہاں سے اخبار کا دو ورقہ منگا کر دیکھا۔ واقعی اس میں مندرج تھا کہ راہیں چوڑی کرنے پر اور حویلیاں اور دکانیں ڈھانے پر بلوہ ہوا اور رعایا نے پتھر مارے اور مجسٹریٹ زخمی ہوا۔ حیران ہوں کہ اگر یوں تھا تو صاحب وہاں سے چلا کیوں آیا اور اگر حاکم نہیں آیا تو آپ کیونکر تشریف لائے۔ ہر سنانہ خواہش ہے کہ آپ اس حال کو مفصل لکھیے۔

ہاں صاحب منشی عبداللطیف صاحب ارادہ کر کر رہ گئے۔ اپنی نثریں کیوں نہیں بھیجتے۔ کیا میرے خطوط اردو زبان میں دیکھ کر وہ ایسا گمان کرتے ہیں کہ یہ فارسی نثر لکھنی بھول گیا۔ میری طرف سے ان کو دعا کہو اور کہو کہ صاحب ہماری نثر دیکھنے کے مشتاق ہیں۔

بھتیج نصیر الدین اور ذکیہ بیگم اور شیخ عبدالسلام اور کلثوم بیگم کو دعا پہونچے اور بیگم کو یہ معلوم ہو کہ بوا میں اب بھی کچھ نہیں کہتا۔ اگر اتفاق ہوا تو قریب عید کے یا بعد عید کے میں تم کو دیکھوں گا۔ اور تمہارا قرآن پڑھنا سنوں گا۔ لیکن تم اپنے باوا سے یہ بات نہ کہنا، اور اپنے دل ہی میں رکھنا۔ کس واسطے کہ اگر وہ سن لیں گے تو مجھ سے اس کی تفصیل پوچھیں گے۔ نگاشتہ و رواں داشتہ چہارشنبہ ۱۴ رمضان سنہ ۱۲۶۹ھ و ۲۲ جون ۱۸۵۳ء

کتابیات

۱۔ آفاق حسین آفاق — نادراتِ غالب
سلسلۂ مطبوعات ادارۂ نادرات کراچی — ۱۹۴۹ء

۲۔ امتیاز علی عرشی — مکاتیب غالب
سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ ریاست رام پور — ۱۹۳۷ء

۳۔ غلام رسول مہر — خطوطِ غالب — ۱۹۵۱ء
شیخ احمد نیاز لاہور

۴۔ مرزا محمد عسکری — ادبی خطوطِ غالب
انوار المطابع لکھنؤ — ۱۹۳۳ء

۵۔ مہیش پرشاد — خطوطِ غالب
ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد — ۱۹۴۱ء

۶۔ الطاف حسین حالی — یادگارِ غالب

۷۔ اسلوب احمد انصاری — نقشِ غالب
غالب اکیڈمی، نظام الدین نئی دہلی ۱۳ — ۱۹۷۰ء

۸۔ (ڈاکٹر) سید عبداللہ — اطرافِ غالب
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ — ۱۹۷۴ء

۹۔ شیخ محمد اکرام — غالب نامہ
تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور ۱۹۳۶ء

۱۰۔ نظر انصاری — غالب شناسی
انٹرنیشنل ادب (ساہتیہ) ٹرسٹ بمبئی ۵ ۱۹۶۵ء

۱۱۔ مالک رام — ذکرِ غالب
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۶ء

۱۲۔ مالک رام — عیارِ غالب
علمی مجلس دہلی ۶ ۱۹۶۹ء

۱۳۔ (ڈاکٹر) یوسف حسین خاں — غالب اور آہنگ غالب
غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی ۱۳ ۱۹۷۱ء

۱۴۔ آل احمد سرور — تنقیدی اشارے
سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۴۲ء

۱۵۔ خورشید الاسلام — تنقیدیں
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹ء

۱۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی — مضامین نو
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء

۱۷۔ (ڈاکٹر) سید عبداللہ — میر امن سے عبدالحق تک
چمن بکڈپو اردو بازار دہلی ۶

۱۸۔ امیر اللہ خاں شاہین — اردو اسالیب نثر
امیر اللہ خاں شاہین میرٹھ ۱۹۷۷ء

۱۹۔ سید عابد علی عابد — اصول انتقادات ادبیات اردو
مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۶ء

۲۰۔ غلام غوث بیخبر — انشائے بیخبر
مرتضائی پریس آگرہ ۱۹۳۶ء

۲۱۔ منظر عباس نقوی — نثر، نظم اور شعر
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۸ء

۲۲۔ ایف ایل لیوکس — اسٹائل
کیسل اینڈ کمپنی، لندن ۱۹۵۶ء

۲۳۔ مڈلٹن مرے — دی پرابلم آف اسٹائل۔
اکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۵ء

۲۴۔ عبداللہ یوسف علی — انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ
ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۶ء

۲۵۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین — غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۲۶۔ صحیفہ — غالب نمبر حصہ اول ۱۹۶۹ء

۲۷۔ نقوش — غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۲۸۔ نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء

۲۹۔ دلی کالج میگزین — دلی نمبر ۱۹۵۹ء